

محمد حسین ازاد

ع ل

سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادبیات اردو شمارہ (۵۱)

محمد حسین آزاد

یعنی

شمس العلما مولوی سیّد محمد حسین آزاد دہلوی

کے

حالاتِ زندگی اور تصنیفات و کلام پر تبصرہ

از

جہاں بانو بیگم (نقوی) ایم۔ اے

سنہ ۱۹۴۰ء

ناشر

ادارۂ ادبیات اردو خیریت منزل خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن

قیمت (عا)

شعبۂ نسوان ادارۂ ادبیات اردو کی دوسری مطبوعہ کتابیں

(۱) نذر دکن — مرتبہ — سکینہ بیگم صاحبہ

(۲) من کی بپتا — از — لطیف النساء بیگم صاحبہ ایم۔ اے

(۳) سوتیلی ماں — از — رابعہ بیگم صاحبہ

(۴) رسائل طیبہ — مرتبہ — سکینہ بیگم صاحبہ

(۵) بچوں کی نظمیں — از — لطیف النساء بیگم صاحبہ ایم۔ اے

(۶) نذر ولی — از — طالبات جامعہ عثمانیہ

مطبوعہ

مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس حیدرآباد۔

فہرست

دیباچہ عمومی

شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد اُردو کے اُن مخصوص محسنوں میں سے ہیں جن کا نام اور خدمات تاریخ ادب اُردو کا جزو لاینفک ہیں لیکن یہ ہماری زبان کی بدقسمتی ہے کہ اس کے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کے متعلق اب تک جیسا چاہیے کوئی کام نہیں کیا گیا۔ نہ ان کے سوانح حیات شایع ہوئے اور نہ ہی ان کے کارناموں کا تجزیہ کرکے ان کی حقیقی عظمتوں اور حیثیتوں کو اُجاگر کیا گیا۔

یہ ہمارا سب سے پہلا فریضہ ہے کہ نام نیک رفتگاں کو ضایع نہ ہونے دیں، ان کی حیات اور کارناموں کے مطالعہ سے مستفید ہوتے رہیں اور اپنے مستقبل کے بنانے میں ان سے سبق حاصل کریں۔ آزاد کی اہمیت اُردو ادب میں مسلم ہے، لیکن کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ آج تک کسی نے ان کے سوانح حیات کے مرتب کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ ابھی حال میں ایک کتاب "آب حیات کے لطیفے" شایع ہوئی ہے، جس کے دیباچہ میں آزاد کے کچھ حالاتِ زندگی بھی آگئے ہیں، لیکن مستقل سوانح حیات کی ضرورت باقی تھی، جس کو ادارۂ ادبیات اُردو کے شعبہ نسوان کی سرگرم رُکن محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ ایم اے نے نہایت

خوش سلیقگی اور کامیابی کے ساتھ تکمیل کو پہنچایا ہے۔ جہاں بانو بیگم صاحبہ اصل میں وہی "ج۔ نقوی" ہیں جو حیدرآباد کی مشہور ادیبہ اور کئی مفید و دلچسپ کتابوں کی مصنفہ ہیں۔ "رفتارِ خیال" ان کے رشحاتِ قلم کا پہلا مجموعہ ہے جو کتابی صورت میں شایع ہو کر کافی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے کئی اور مضامین اور کتابیں بھی لکھی ہیں اور ان کا شگفتہ اسلوب بیان بہت مقبول ہے۔ زیر نظر کتاب اصل میں اُن کے امتحان ایم، اے کا مقالہ ہے، جس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ مؤلفہ کی نظر کتنی وسیع ہے اور وہ تحقیقی کام بھی کس خوبی سے انجام دیتی ہیں۔

ادارہ کے شعبہ نسوان کی طرف سے اس سے قبل "نذرِ دکن" (مرتبہ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ معتمد شعبہ نسوان) نذرِ ولی، من کی بپتا (از لطیف النساء بیگم صاحبہ ایم اے) اور سوتیلی ماں (از محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ صدر شعبہ نسوان) جیسی مفید کتابیں شایع ہو چکی ہیں اور اب اس سوانح آزاد کی اشاعت سے اس کی مطبوعات میں اور ایک مفید اور معیاری کتاب کا اضافہ ہو رہا ہے، توقع ہے کہ یہ شعبہ صنفِ نازک میں علمی و ادبی بیداری پیدا کرنے میں پوری طرح کامیاب ہوگا اور یہ خود کوئی کم فخر کی بات نہیں ہے کہ اس کی طرف سے قلیل عرصے میں پانچ کتابیں شایع ہو چکی ہیں۔

سید محی الدین قادری زور
معتمد اعزازی

یکم جنوری سنہ ۱۹۴۰ع

عرضِ حال

کارلائیل کہتا ہے "تاریخ عالم صرف اس کے بڑے بڑے اشخاص کی تاریخ کا نام ہے" مگر ہمارے ملک میں بڑے بڑے آدمی بھی گوشۂ گمنامی میں بستے ہیں۔ آزاد جیسے شخص کی تاریخ حیات آج تک کسی نے لکھنے کی زحمت گوارہ نہ کی۔ ع

کہ آبِ چشمۂ حیواں درونِ تاریکی است

اتنا بڑا آدمی، ایسا زبردست ادیب و انشا پرداز اور یوں عالم کس مپرسی میں پڑا رہے۔ نذیر احمد اور حالی مرحوم کی سوانح عمریاں لکھی گئیں مفصل نہ سہی مختصر و تشنہ ہی۔ مگر لکھا تو گیا ہے۔ آزاد کے معاملے میں سب ساکت و صامت بیٹھے ہیں۔ اور یہی سمجھ لیا ہے کہ اُنھ "کیجیے یاد نہ بھولے ہوئے افسانے کو"

آزاد کو انتقال کیے ۲۹ برس ہوگئے۔ مگر جیسی چیز ان کی زندگی کے متعلق تیار ہونی چاہیے تھی وہ اب تک نہ ہوسکی۔ تذکروں میں اور شعراء و مصنفین کی طرح آزاد کا ذکر بھی ضمناً و تذکرۃً کیا گیا ہے۔ مثلاً سب سے

پہلے مولف خمخانۂ جاوید نے ان کا ذکر کیا۔ اور ابتدا اس طرح سے کی ہے
"آزاد جنھوں نے تذکرۂ آبِ حیات لکھ کر اپنے نام کو زندۂ جاوید بنا دیا"
اور پھر اُن کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا کچھ یوں ہی سا ذکر کر دیا ہے۔ نمونہ بھی
ان کے کلام کا دیا ہے۔ آبِ حیات کو جو ان کا ادبی شہکار ہے نظر انداز کر دیا ہے۔

پھر سیر المصنفین نے لکھا۔ ان کے یہاں آزاد کی دیوانگی کا حال ذرا
تفصیل سے ہے۔ آبِ حیات کی خوب جی کھول کر تعریف اور پھر کچھ مذمت بھی
کی ہے۔ وہی غلط بیانیوں کا الزام موجود ہے۔ جو بدنصیب آزاد کے دامن کا
ایک ان مٹ دھبّہ بن گیا ہے۔ گویا آزاد نے جو کچھ بھی لکھا سب من گھڑت
قصّے ہیں۔ کاش جبرئیل علیہ السّلام ہی ان کے تابع ہو جاتے اور لکھتے وقت
کہتے جاتے کہ یوں نہیں یوں لکھو۔

مصنفِ گلِ رعنا تو خون لگا کر شہیدوں میں داخل ہوئے ہیں۔ ایک
دو مضمون میں قصّہ ہی ختم کر دیا ہے۔ زیادہ حصّہ ان کے صفحات کا اقتباس
کی بھرتی سے معمور ہے۔ نہ ان کی ادبی خدمات کا ذکر ہے نہ تعلیمی سرگرمیوں کا
بیان ہے۔ نہ زندگی کے حالات ہی بتائے ہیں۔ کچھ کتابوں کا ذکر برسبیلِ تذکرہ
بہت ہی مختصر پیرایے میں کر دیا ہے۔ تاریخ پیدائش سرے سے ندارد ہے۔
وفات کا سنہ جو لکھا ہے وہ غلط۔

پھر سکسینہ ہیں۔ یہ نچوڑ ٹھہرا سارے تذکروں کا۔ اب کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجیے"۔ انھوں نے کچھ یہاں سے لیا کچھ وہاں سے کچھ ادھر سے کچھ ادھر سے اور یوں ع

لائے ہیں باغ سے اوروں کے لگا کر ڈالی

اب رہے ڈاکٹر گراہم بیلی۔ ان کا تذکرہ تو اس کا عکس ہے۔ وہ نہ لکھیں بھی تو شکایت کب ہو سکتی تھی۔

سروری صاحب کی جدید اردو شاعری البتہ آزاد کو ایک گونہ تاریخی اہمیت دیتی ہے تاہم وہ بھی تشنہ ہے۔

کیفیؔ دہلوی نے منشورات میں آزاد پر ایک بحث کی ہے۔ انھوں نے بھی اور تذکروں کی مدد سے اپنی حتی الوسع بڑی کدوکاوش سے ان پر قلم اٹھایا ہے۔ سروری صاحب کی طرح آزاد مرحوم کی ادبی خدمات کا سچے دل سے اعتراف کرتے ہیں۔ وہ آزاد کو فارسی کا ایک عالم متبحر اور عربی کا بہت بڑا عالم مانتے ہیں۔ اس طرح انھوں نے کوئی تذکرہ نہیں لکھا لیکن وہ معترف ہیں کہ مشاہیر عالم کی صف میں آزاد کا کیا درجہ ہے۔ اور ان پر ۲۰ - ۲۲ صفحات کا مضمون لکھا ہے۔

اکثر نقادوں اور سوانح نگاروں نے ان کی اکثر کتابوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔

ان کی کتاب پر کتاب برآمد ہوتی جاتی ہے جس سے اندازہ لگتا ہے کہ آئندہ بھی ان کی کچھ کتابیں ضرور شائع ہونگی۔

ہم نے اپنی اس کتاب میں حسب ذیل عنوانات پر اس تمام مواد کو فراہم کیا ہے جو بالعموم اور تذکرہ نویسوں نے چھوڑ دیا تھا:۔

(۱) خاندانی حالات جس میں حسب، نسب۔ مولوی باقر مرحوم کی شہادت کا واقعہ اولاد۔ اُن کا خاندانی شجرہ۔

(۲) عادات وخصائل۔ (۳) خوراک ولباس۔

(۴) دیوانگی کے حالات۔ ان کو اس عالم میں کس کس نے دیکھا۔

(۵) ان کی موت کے سلسلے میں ان کی قبر کی تصویر بھی چسپاں کی ہے۔

(۶) آزاد کی مندرجۂ ذیل مشہور کتابوں پر نہایت دلچسپی کے ساتھ نظر ڈالی ہے۔

آب حیات	سخندان فارس	سپاک و نماک
دربار اکبری	نگارستان فارس	سیر ایران
نیرنگ خیال (حصہ اول و دوم)	فلسفۂ الہیات	مکتوبات آزاد

آزاد کے تنقیدی پیرایہ پر ایک طویل مضمون دیا ہے۔

سب سے آخر

آزاد کا درجہ اردو ادب میں کیا ہے

اس کو نہایت تفصیل سے بتایا ہے

جہاں بانو بیگم

آزاد کے حالاتِ زندگی

تاریخ ولادت اور خاندان

اُردو کے اس مایۂ ناز ادیب کی ولادت ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۴۵ھ مطابق ۱۸۳۰ء کو دہلی میں ہوئی۔ ان کی تاریخ پیدائش "ظہور اقبال" سے نکلتی ہے۔

مولوی محمد حسین آزاد کے آباؤ اجداد شاہ عالم کے زمانے میں ہمدان (ایران) سے براہ کشمیر ہندوستان آئے۔ اور خاک ہند ایسی دامن گیر ہوئی کہ یہیں کے ہو رہے۔ آباؤ اجداد کا پیشہ اجتہاد تھا۔ چنانچہ یکے بعد دیگرے بہت سے مجتہد اس خاندان میں پیدا ہوئے۔

آزاد مولوی محمد باقر مرحوم کے خلف الرشید تھے۔ جو خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق کے دلی دوست تھے۔ شمالی ہندوستان میں سب سے پہلا اُردو اخبار نکالنے کا سہرا انھیں کے سر ہے۔ یہ اخبار ۱۸۳۶ء میں انہوں نے نکالا۔ اس واقعہ کا ذکر مولانا آزاد نے آب حیات کے صفحہ ۲۶ پر کیا ہے اس کا نام "اُردو اخبار" ہفتہ وار تھا۔ اس کی اب کوئی کاپی نہیں ملتی۔ کیونکہ یہ غدر میں ضبط ہو گیا تھا۔ مولوی محمد باقر پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ

اُنھوں نے دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر کو بجائے اپنے ہاں پناہ دینے کے باغیوں کے حوالے کردیا۔ بالآخر اسی الزام پر ان کو شہید کردیا گیا۔

مولوی محمد باقر صاحب شیعوں کے بہت بلند پایہ مجتہد تھے۔ جو اس وقت کشمیری دروازہ چھوٹے بازار میں رہتے تھے۔ ان کا قدیم مکان اب بھی موجود ہے۔ اور ان کے اعزا و اقربا اس مکان میں رہتے ہیں ان کے کئی مکان قریب قریب تھے۔ ان میں سے ایک اخبار کا دفتر اور چھاپہ خانہ تھا۔ دوسرا خود ان کی سکونت کا مکان تھا۔ اور تیسرا امام باڑہ۔ جس کی تاریخ ذوق نے کہی تھی۔

تعزیت گاہِ امام دارین

اس بستی کے قریب باقر صاحب نے ایک مسجد بھی تعمیر کرائی تھی جو اب تک موجود اور "کھجور والی مسجد" کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں مولوی صاحب نماز پڑھتے تھے۔ اور وعظ بھی کیا کرتے تھے۔ مولوی صاحب کا ہندوستان میں اُردو کا پہلا چھاپہ خانہ تھا۔ اور اس میں عموماً مذہبی کتابیں چھپا کرتی تھیں۔ اس واقعہ کا حوالہ مرزا غالب نے اپنے خطوط میں درج کیا ہے۔ ان کا ذاتی کتب خانہ بھی غدر کی نذر ہو گیا۔ ان کا خاندانی مذہب امامیہ تھا۔

آزاد مغلوں کے معزز خاندان کی ایک بے مثل یادگار تھے۔ ان کی والدہ

ایرانی النسل تھیں۔

مولوی محمد باقر کی وجہ شہادت | یوں تو مولوی محمد باقر مسٹر ہڈسن کے نزدیک کئی جرایم کے مرتکب تھے مثلاً (۱) ۱۸۵۶ء میں مولوی صاحب نے سیاسی رنگ کا پہلا اُردو اخبار دہلی سے جاری کیا تھا۔ جس کے مدیر وہ خود تھے اور جس میں بقول ان کے انگریزوں کے خلاف بہت سخت مضامین لکھے جاتے تھے۔ اور بہادر شاہ ظفر کی تعریف چھپا کرتی تھی۔

(۱) یہ کہ وہ ٹیلر صاحب کے قاتل تھے۔

(۲) ٹیلر صاحب کی تحریر سچی نہ تھی۔ دستخط جھوٹے تھے۔ دستخط کا قصہ یہ ہے کہ ٹیلر صاحب جو نسلاً انگریز تھے اور غدر سے پہلے دہلی کالج میں پروفیسر رہ چکے تھے۔ انھوں نے باقر صاحب سے اُردو اور فارسی بھی پڑھی تھی۔ غدر کی فتنہ خیزیوں سے پناہ لینے وہ مولوی صاحب کے گھر گھس آئے۔ اُن کے گھر سے زیادہ کوئی محفوظ جگہ ان کے لیے ربع مسکون میں نہ تھی۔ وقت بہت نازک تھا ہندو مسلمان دونوں انگریزوں کے خون کے پیاسے بنے ہوئے تھے۔ مولوی صاحب نے ٹیلر صاحب کو اپنے گھر رکھ تو لیا تھا۔ مگر ہر آن ان کی موت کا کھٹکا لگا ہوا تھا آخر زندگی کا ساغر لبریز ہو گیا وقت نے غمازی کی یا محلہ والوں کی سرگوشیوں سے بھنک پڑی۔ باغیوں کو سراغ لگ ہی گیا۔ آزاد کے مکان کا سب نے محاصرہ

کر لیا۔ دھمکیاں دینی شروع کیں کہ ٹیلر صاحب کو حوالہ کر دو ورنہ ہم گھر بار کو آگ لگا دیں گے۔ مولوی صاحب کو گھر کا برباد ہو جانا منظور تھا مگر اپنے مہمان کو حوالہ کر دینا گوارا نہ تھا جب مسٹر ٹیلر نے جوش عقیدت اور اظہار خلوص کا یہ رنگ دیکھا کہ ان کی خاطر مولوی صاحب کے گھر پر آنچ آ گئی تو ان کی شرافت نفس اور پاکیزگی ضمیر کو جوش ہوا اپنے استاد سے ضد اور اصرار کر کے باہر نکل آئے۔ ان سے پہلے اظہار تشکر میں ایک لاکھ پچہتر ہزار کے نوٹ مولوی صاحب کی نذر کیے۔ پھر دنیا کی بے اعتباری اور غداری کا جو خیال آیا تو اپنے دستخط بھی کر دیے۔ اور یہ صاف صاف لکھ دیا کہ یہ رقم میں نے بطیب خاطر مولوی صاحب کی نذر کی ہے۔ یہ سب کچھ ہوا۔ مسٹر ٹیلر جوں ہی باہر نکلے۔ قضا کے ہرکاروں نے باغیوں کے بھیس میں اُن کا خیر مقدم کیا۔ اور آپے سے باہر ہو کر اس بے گناہ کو قتل کر ڈالا۔

جب غدر کی آگ فرو ہو گئی تو مولوی صاحب نے اپنی انتہائی شرافت وضع داری۔ صدق گوئی اور ایثار نفس کا ثبوت اس طرح دیا کہ وہ تحریر جس پر ان کے دستخط تھے اور تمام نوٹ ہڈسن صاحب کے ہاں لے گئے۔ ابھی ان کی زبان سے تمام واقعات سننے بھی نہ پائے تھے کہ دفعتاً انھوں نے سوال کیا "مسٹر ٹیلر کہاں ہیں" اس کا جواب صاف سیدھا اور سچا ملنے پر

مسٹر ہڈسن کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اُنھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً حکم دیا "گولی مارو"، حکم کی دیر تھی کہ آناً فاناً میں محمد باقر کی لاش خاک وخوں میں فرش زمین پر تڑپنے لگی۔ اس روح فرسا حادثہ کے بعد ان کے گھر بار کو ضبط کرنے کا حکم جاری ہوا۔ ان کی منقولہ و غیر منقولہ جائیداد ضبط کر لی گئی۔ اُردو اخبار کا ایک ایک پرچہ ضبط کر کے بحق سلطنت جلوا دیا گیا۔

آزاد نے باپ کو شہید ہوتے گھر بار کا خاتمہ ہوتے دیکھا تو ان کے ہوش پرّاں تھے۔ اپنے ایک جان نثار ملازم کے ساتھ اپنے اہل وعیال کو سونی پت بھجوا دیا۔ صرف استاد ذوق کا کلام جو کچھ بھی غدر کی دستبرد سے بچ گیا تھا بغل میں مارا اور چل کھڑے ہوئے۔ حیدر آباد دکن، لکھنو اور خدا جانے کہاں کہاں مارے مارے پھرے۔

ذیل میں ہم آزاد کے اعزا و اقربا پر ایک نوٹ لکھتے ہیں جو بظاہر کسی قدر طولانی ہے لیکن ان میں سے ہر شخص کا تعلق آزاد سے ہے۔ جی نہیں چاہتا کہ آزاد کی اولاد صوری کا ذکر نہ لکھا جائے۔

شکسپیر کے رشتہ کا ایک شخص پانچ سال ہوئے فوت ہو گیا۔ لندن کے اخباروں نے اس کی تصویر دی۔ ۳، ۳½ سو سال بعد مقابلہ کرنے سے شیکسپیر کی تصویر اس سے ملتی جلتی تھی۔ اس سے پتہ چلا لیا کہ یہ شیکسپیر کا

کوئی عزیز ہے۔

ڈکنس کو مرے ہوئے ۵۰ سال گذرے لیکن ایک موچی جو ڈکنس کا جوتا بناتا تھا بہت بڑی عمر کو پہنچ کر جب حال میں مرا تو انگلستان کے اخباروں میں اس کا اور اس کے حالات کا ذکر آیا محض اس بناء پر کہ اس کا لگاؤ ڈکنس سے تھا۔

سودا اور میر کی ذریات میں کسی کا نشان تک باقی نہیں اس کی وجہ یہ ہے لوگوں نے ان فرماں روایان سخن کے حالات کو تفصیل کے ساتھ قلم بند نہیں کیا۔ جتنا ان کو یاد رکھا اتنا ہی ان کے خاندان کو فراموش کیا۔

اولاد[1] آزاد مرحوم کے ہاں ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئی لڑکے کا نام محمد ابراہیم تھا یہ غالباً ذوق سے انتہائی محبت کا نتیجہ تھا کہ بیٹے کا نام انھوں نے ابراہیم رکھا۔ انھیں یہ پیار سے "ابرو" کہا کرتے تھے۔ ان کے خطوط میں ان کا ذکر اس لاڈلے نام سے آیا ہے۔ محمد ابراہیم پنجاب ہی میں منصفی کے عہدہ پر مامور تھے۔ باپ کے ۱۰ سال بعد ۱۹۲۰ء میں انتقال کیا۔ کثیر الاولاد تھے۔ آزاد کو

---

[1] ۔ آغا محمد طاہر فلسفۂ الہٰیات کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ آزاد مرحوم کے ہاں ۱۵، ۱۶ بچے پیدا ہوئے۔ اکثر بڑھے۔ جوان ہوئے۔ پروان چڑھے مگر قریب قریب سب آنکھوں کے سامنے خاک کا پیوند ہو گئے۔

ان کے بچوں سے انتہا درجہ محبت تھی بچے باپ سے بالعموم علیحدہ رہتے تھے۔ کیونکہ اکثر ملازمت کے سلسلے میں انھیں باہر ہی رہنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ اگرچہ دیوانگی نے آزاد مرحوم کے خیالات وجذبات کو تہ و بالا کر رکھا تھا اور وہ کسی کام کے نہ رہے تھے۔ لیکن ان بچوں سے آزاد کو جو محبت تھی وہ دیوانگی کے عالم میں بھی ان کے دل میں سرد نہ ہوئی۔ جس طرح ہوش وحواس کے زمانہ میں ان سے پیار کی باتیں کرتے اور ان کے ساتھ کھیلتے تھے اسی طرح ان کا وہی برتاؤ جنون میں بھی جاری رہا۔ لیکن اور لوگوں سے جو ہوش وحواس میں خلوص تھا وہ اب باقی نہ رہا تھا۔ فقدان محبت کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان کے محبوب دوست اگر کوئی بات ان کی طبیعت کے خلاف کرتے تو وہ اس کی تاب نہ لاتے۔ بگڑ بیٹھتے۔ اور ایسی حرکات کرتے جن سے ان کو رنج ہوتا۔

اپنی اکلوتی لڑکی سے آزاد مرحوم کو گویا عشق تھا۔ انھوں نے اس کو بڑے شوق سے عربی، فارسی کی تعلیم دی تھی۔ وہ نوشت وخواند میں ان کا دست و بازو تھیں۔ ان کی کتابوں کے سارے مسودے وہی نقل کرتیں۔ ایک روایت کے بموجب آغا محمد اشرف لکھتے ہیں کہ "نصیحت کا کرن پھول" انھیں کی تصنیف ہے۔ ان کی شادی ریاست پٹیالہ کے خلیفہ نام ایک مشہور ومعزز خاندان میں ہوئی تھی۔ ان کے شوہر خلیفہ محمد کاظم وہاں کے سشن جج تھے۔ اور ان کے بھائی

خلیفہ سید محمد حسین ریاست کے وزیر اعظم تھے۔ آزاد کی اس ہونہار اکلوتی لڑکی کا انتقال عین عالم شباب میں ہوگیا جس کا انھیں بے حد صدمہ ہوا۔ اسی غم والم کی شدت میں ان پر جنون کے آثار ظاہر ہوئے۔

سیر ایران میں صفحہ ۶۰ پر لکھا ہے "میری اس بیٹی کی موت جو مجھے سات بیٹوں سے گراں تھی میری تصنیفات میں میرا دہنا ہاتھ تھی۔ اس کے مرنے سے میرا دل ٹوٹ گیا اور تصنیفات کا قلمدان الٹ گیا یہاں تک کہ اکثر ہوشمندوں کو جنون کا شبہ ہوگیا۔

شجرۂ نسب | آغا محمد اشرف صاحب نے آزاد مرحوم کا جو شجرہ نسب روانہ فرمایا ہے وہ بجنسہٖ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

مولوی محمد باقر (اردو اخبار ۱۸۳۶ء)

مولوی محمد حسین آزاد

آغا محمد ابراہیم مصنف مرحوم — امت السکینہ

مرضیہ بیگم مرحوم

آغا محمد اسمٰعیل مرحوم

آغا محمد یوسف مرحوم

آغا محمد طاہر

آغا محمد باقر ایم۔ اے

خاکسار (آغا محمد اشرف)

"ان کے علاوہ تین بہنیں ہیں، جو قلت گنجایش کی وجہ سے اوپر نہیں لکھ سکا۔ یہ تینوں زندہ ہیں۔ میرے سب سے بڑے بھائی آغا طاہر مولانا آزاد کی کتابوں کا کاروبار کرتے ہیں۔ آغا محمد باقر دہلی کے ایک کالج میں استاد ہیں۔ اور خاکسار کا حال آپ جانتی ہی ہیں۔ میری ایک بہن ایران میں مقیم ہیں۔ ان کے شوہر ہندوستانی ہیں۔ لیکن ایک عرصہ سے ایران میں تیل کمپنی میں ملازم ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا قیام وہاں ہے۔ اگرچہ وہ ہندوستان اکثر آتی رہتی ہیں۔"

آغا محمد طاہر صاحب یہ محمد ابراہیم صاحب کے خلف اکبر ہیں اور آزاد بک ڈپو کے مالک و منتظم۔ مجھے صاحب موصوف سے مولانا آزاد کے متعلق کچھ معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ آپ نے امید تو بہت بندھائی تھی اور میرے استفسا پر لکھا بھی تھا کہ "آپ کے مطلوبہ مضامین کی نسبت میں ہر قسم کی خدمت کو حاضر ہوں۔ مگر دریا کوزہ میں کیسے بند کر کے بھیج دوں۔ لکھنے کو تو بہت مختصر سی بات ہے کہ حضرت آزاد کے حالات لکھ دیجیے۔ مگر حقیقتاً یہ مضمون شاید ایک دفتر میں بھی نہ آسکے۔ چند عنوان قائم کر کے مجھے لکھ بھیجیے۔ اس پر میں ۸، ۱۰ صفحہ لکھ کر پیش خدمت کر دونگا۔" میں نے حسب تجویز چند عنوان بھیجے۔ لیکن اُنھوں نے خلاف توقع اب تک کوئی جواب نہ دیا۔

مولانا حسن نظامی صاحب دیباچۂ مکتوبات، آزاد میں لکھتے ہیں "ایک دن

میں اپنے رین بسیرے میں بیٹھا تھا۔ گرمی کی شدت۔ دھوپ کی تیزی۔ اوسان کی گھبراہٹ کہ ایک نوعمر صاحبزادے سائیکل لیے ہوئے سامنے آئے۔ گورا چہرہ۔ درمیانہ قد۔ موثر آنکھیں۔ پیشانی پر پسینہ کے قطروں کی قطار۔ تمازت آفتاب سے لال لال رخسار۔ لکنت آلود زبان میں کہا، حسن نظامی سے ملنا ہے حسن نظامی نے کہا آپ اس سے مل لیے۔ تشریف رکھیے۔ نام بتائیے۔ کام فرمائیے۔ بولے طاہر کہتے ہیں۔ آزاد دہلوی کا پوتا ہوں۔ اُردو نثر لکھنے کا شوق ہے۔ اس لیے آیا ہوں کہ لکھنے کا ڈھنگ آجائے۔

سُبحان اللہ! جناب آپ تو سراپا اُردو ہیں۔ خدا نے صورت بھی پرلطف مضمون کی طرح دی اور اس کے اندر خون بھی اُردو کے اُستاد کا بھرا۔ آپ کو کسی کے بتانے اور سکھانے کی کیا ضرورت، آیا کیجیے یہ آپ کا گھر ہے۔ ایک برس کے بعد انھی ملا طاہر کے برابر لاہور شہر میں ایک مکان کے اندر کھڑا تھا، ور اور وہ کہہ رہے تھے دادا جان یہاں سوتے تھے۔ یہاں کھاتے تھے۔ یہاں لکھتے تھے۔ یہاں ہم بچّے ان کے سامنے کھیلتے تھے۔ اللہ اکبر! یہ اس شہرۂ آفاق شخص کا گھر ہے جو ہندوستان کا بہت بڑا مصنّف اور انشا پرداز تھا۔ ایک حالت آتی تھی ایک حالت جاتی تھی کہ یہ گھر یورپ میں ہوتا تو لاکھوں آدمی زیارت کو آیا کرتے۔ ہندوستان قبروں کی زیارت کرتا ہے۔ ان چیزوں کی قدر اس کو

نہیں آتی'' بہرکیف اس زمانہ میں آغا محمد طاہر صاحب نے اپنے جد عالی وقار
کے سرمایۂ ادب کو بڑی آب و تاب سے شائع کرنے میں اپنی بساط بھر سعی فرمائی
ہے۔ اور بڑی حد تک ان کے نام کو چمکا دیا ہے۔

مولوی رضاء اللہ صاحب فرزند منشی ذکاء اللہ مرحوم کوچۂ چیلان دہلی
سے میرے دریافت کرنے پر ارقام فرماتے ہیں'' مولانا آزاد مرحوم کے پوتے
ہمارے گھر کے بہت ہی قریب رہتے ہیں۔ ان کا اسم گرامی آغا محمد طاہر ہے
اور وہ آج کل ''آزاد منزل'' سولن میں مقیم ہیں۔ وہ آپ کے لیے بہت کچھ
معلومات فراہم کر سکتے ہیں۔ میں نے ان کے ماموں صاحب سے جو ہمارے
عنایت فرما ہیں اور ہمسایہ ہی میں رہتے ہیں دریافت کیا تھا تو ان کی واپسی
اکٹوبر کے اوائل میں بتائی تھی۔ وہ آجائیں اور میں یہاں رہوں لکھنو یا کسی
اور جگہ نہ جاؤں تو میں خود ان سے ساری معلومات حاصل کر کے بھیج دوں گا
مگر ان کی طرف سے بھی مایوسی ہی رہی۔ مگر شاید انھیں کے ایماء سے مولوی
فرحت اللہ صاحب نے جو منشی ذکاء اللہ مرحوم کے دوسرے صاحبزادے ہیں
آزاد مرحوم کے متعلق ایک دلچسپ نوٹ دیا ہے۔ جس کا زیادہ تر حصہ
ان کی دیوانگی کے حالات میں درج ہے۔

ڈاکٹر سید سجاد صاحب نے فرمایا ہے کہ آغا محمد طاہر صاحب ۱۹۲۷ء

یا ۱۹۲۶ء میں آزاد مرحوم کی تصانیف کے قلمی نسخے خود ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے
مسودے اور ذوق کے قلم کی اصلاحیں برائے فروخت حیدر آباد لائے تھے۔
تحریک سر اکبر کے پاس پیش کی گئی۔ ان کا ارشاد ہوا ان نایاب چیزوں کی
یونیورسٹی کلب میں نمائش کی جائے۔ طاہر صاحب نمایش کے نام سے گھبرا گئے۔
کچھ نواب باب حل و عقد نے ان پر کوئی توجہ نہ کی اور پھر خدا جانے ان کے دل میں
کیا سمائی کہ مسودوں کے بستے باندھ کر دتی کی راہ لی۔

یوں تو آغا صاحب نے خود کوئی کتاب نہیں لکھی لیکن آزاد کی ہر کتاب
پر ایک ناقدانہ تمہید یا دیباچہ لکھ کر ایک گونہ احسان کیا ہے۔ خصوصاً فلسفہ الہیات
کا دیباچہ " ادبی دنیا کے رہنما کی وجدانی زندگی کا ایک صفحہ " لکھ کر انھوں نے
حقیقت میں آزاد کی ہسٹری کے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔

" نگارستان فارس " میں صفحہ ۲۳۴ پر " عرض کیفیت " کے عنوان سے
طاہر صاحب نے ایک سرسری سا ذکر اپنے بہن بھائیوں کا کیا ہے۔ لکھتے ہیں
" میاں باوا مرحوم کے بعد والد مرحوم نے ان کے مسودوں کو کھولا۔ سرسری سی
نظر ڈالی اور پھر یہ بستہ باندھ دیا کہ فرصت کے وقت دیکھیں گے۔ مگر تقدیر کا
جگر دوز تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ فلک کج رفتار کو بھلا کب بھاتا تھا۔ نصیبوں کا
پھیر دیکھیے کہ اس سال میرے کڑیل جوان بھائی آغا محمد اسمعیل اسیر ایم۔ اے کا

امتحان دیتے دیتے سرسام کا شکار ہو گئے۔ ان کی صف ماتم اٹھنے نہ پائی تھی کہ یکے بعد دیگرے دو جوان بہنیں ننھے ننھے بچے چھوڑ کر راہی ملک عدم ہوئیں۔ یہ زخم ابھی بھرنے نہ پایا تھا کہ یکایک مصیبت کا آسمان ٹوٹ پڑا۔ اور میرے دوسرے بڑے بھائی جوان مرگ آغا محمد یوسف خلیل بیا ہے تیا ہے سیروں خون ڈال کر جان بحق تسلیم ہوئے۔ غرض کہ ان پے در پے صدمات نے والد ماجد کو ایسا مضمحل کر دیا کہ پھر کبھی ان چیزوں کا نام ہی نہ لیا۔ آخر یہ تمام مرحلے طے کرنے کے بعد وہ بھی ۸ ۔ ڈسمبر ۱۹۲۰ء کو عارضۂ قلب کے بہانے اس بے وفا دنیا سے خفا ہو گئے اور دلی میں ؎

چشم یعقوب میں کہاں نعیم — اپنے یوسف کے پاس دفن ہوئے

آغا محمد اشرف ایم۔ اے | آزاد مرحوم کے پوتے محمد ابراہیم کے فرزند ارجمند ۱۹۱۲ء دہلی میں پیدا ہوئے ڈون اسکول ڈیرہ دون میں عربی و فارسی کے پروفیسر ہیں۔ مگر جب کبھی اپنے وطن مالوف دہلی آتے ہیں آزاد کے قدیم مکان میں رہتے ہیں جہاں سے اردو کا سب سے پہلا اخبار نکلا تھا۔ سفر ان کی زندگی کا ایک دلچسپ مشغلہ ہے۔ نہ معلوم کب سے ان کے سفر کا سلسلہ جاری ہے لیکن جب آزاد مرحوم کے سلسلے میں میرا پہلا خط جناب کی خدمت میں پہنچا تو آپ اپنے مستقر پر تشریف فرما نہ تھے۔ ایک طویل انتظار کے بعد جواب آیا

دلچسپ ہے اس لیے اسے بجنسہٖ نقل کیا جاتا ہے۔ "میں جون ۱۹۳۶ء میں سیاحت کی غرض سے ایران چلا گیا تھا۔ اور آج تقریباً دو مہینہ بعد دہلی واپس آیا تو آپکا خط ملا۔ غالباً آپ کو جواب سے مایوسی ہو چکی ہوگی۔ میں آج ہی صبح سفر سے واپس آیا ہوں اور آپ کو روا روی میں جواب دے رہا ہوں۔ مولانا آزاد کے متعلق اب تک کوئی مستقل تصنیف نہیں چھپی۔ لیکن متفرق مقالات سے کافی مواد مل سکتا ہے" اور چند ماخذ و حوالے دیے جن سے مجھے بڑی مدد ملی۔ اس سلسلے میں لکھتے ہیں " مولانا آزاد ۱۸۶۱ء میں سرکاری طور پر کابل و روس گئے تھے۔ اس کی تفصیل کسی کو معلوم نہ ہو سکی۔ البتہ گزشتہ سال ڈیرہ دون میں سروے آف انڈیا کے دفتر سے کچھ معلومات فراہم ہوئی ہیں جو میں ڈیرہ دون جا کر حاضر خدمت کر سکوں گا"، مگر افسوس کہ وہ معلومات مجھے اب تک وصول نہ ہوئیں اور میرا مقالہ خاتمہ پر آگیا۔ اسی خط کو یوں ختم کرتے ہیں " میرا ارادہ آئندہ سال انگلستان بغرض تعلیم جانے کا ہے۔ اور میرے مقالہ کا موضوع بھی آزاد ہیں۔ اس لیے مجھے آپ کے مقالہ میں بے حد دلچسپی ہے۔ اگر آپ وقتاً فوقتاً مجھے اپنی معلومات سے آگاہ کرتی رہیں تو میں بے حد ممنون ہونگا۔ ایک خواہش یہ اور ہے کہ اپنے مقالہ کی ایک نقل مجھے بھیج دیں تو باعث امتنان ہوگا"۔ علاوہ پروفیسری اور سیاحت کے آپ قلمی دنیا میں بھی کافی شہرت

رکھتے ہیں۔ چنانچہ ماہنامہ ساقی اکتوبر ۳۸ء نمبر میں آپ کا ایک دلچسپ مضمون ایران کے سفر کے متعلق شایع ہوا ہے۔ جس کا عنوان ہے "اُردو شاعری کے استعارے اور تشبیہات"۔ مضمون اتنا دلچسپ ہے کہ جی چاہتا ہے تمام کا تمام یہاں نقل کر دوں لیکن طوالت کا خیال مزاحم ہے۔ یہ ادبی شہ پارہ اپنے اندر شاعرانہ خصوصیات کا ایک ذخیرہ لیے ہوئے جلوہ گر ہوا ہے۔ اُردو شعرا نے ایرانیوں سے جو اپنے ادب کو مالا مال کیا ہے اس کا ایک مختصر خاکہ کھینچ دیا ہے۔ مثلاً :۔

"باغ اور اس کے لوازمات کا تخیل ہندوستان میں ایران ہی سے آیا۔ ایران والوں کو باغ اور پھولوں سے قدرتی محبت ہے۔ غریب سے غریب گھر میں چلے جائیے تو وہاں بھی صحن میں ایک چھوٹا سا حوض ہوگا۔ حوض کے چاروں طرف پھل دار درخت لگے ہوں گے۔ انگور کی بیلوں نے اس کو گھیر لیا ہوگا۔

مجھے جمعہ کا دن شیراز، اصفہان اور طہران میں بسر کرنے کا اتفاق ہوا۔ اس روز شہر کے کاروبار بالکل بند تھے۔ صرف چائے خانے اور نان بائیوں کی دُکانیں کھلی تھیں۔ حد یہ ہے کہ اس روز سفر کے لیے موٹریں بھی نہیں ملتی تھیں۔ اگرچہ شہر کے باہر رونق سب شہروں جیسی تھی۔ ایران میں خر کی سواری کوئی عیب نہیں بلکہ قالین کی جھول ڈال کر بڑے بڑے رئیس اور شرفاء

خروں پر سوار ہوتے ہیں ۔“

مزح زاد کی بہت تعریف کی ہے ۔ یہ ایک گاؤں ہے، طہران سے ۸۰ میل کے فاصلہ پر ۔ وہاں کی چہل پہل، رونق اور آبادی کو بڑے اچھے طریقے سے لکھا ہے ۔ یادش بخیر اس مضمون میں مولانا آزاد نے ”سخندانِ فارس“ میں ایرانی بلبل کے متعلق جو گہرفشانیاں کی ہیں اس کو دہرایا ہے اور لکھا ہے ۔

”زلف کی خوبی یہی تھی کہ سانپوں کی طرح کندھوں پر بل کھائے ۔ لیکن ۱۹۳۵ء سے اعلیٰ حضرت رضا شاہ پہلوی نے حکماً تمام ایران میں مغربی لباس جاری فرمادیا ہے ۔ اس کے ساتھ زلف بھی غائب ہوگئی ۔ تمام ایرانی عورتیں اب مغربی طرز پر بال کٹواتی ہیں ۔ ہمارے شعراء نے ابرو کو خنجر اور کبھی محراب سے تشبیہ دی ہے ۔ لیکن ایران میں مغربی سیلاب نے محراب اور خنجر کی تشبیہ بھی اڑادی ۔ اب تو سینما اسٹار کی طرح ابرو کو تراش کر باریک اور سیدھا بنایا جاتا ہے ۔ جس کی تشبیہ دینا اب ہمارے شاعروں کے بس کی بات نہیں رہی ۔“

”ایران کے پانی میں قدرت نے شیرینی اس غضب کی

رکھی ہے کہ میوہ منہ میں رکھے تو شربت ہو جاتا ہے۔ چھوک کا نام
نہیں۔ خربوزہ کاٹیے تو شیرہ اور شربت پڑا ٹپکتا ہے۔ انگوروں
کے خوشے جب بیلوں سے اُتارتے ہیں تو دانے پھوٹ پھوٹ کر بہتے
ہیں۔ گویا انگور نہیں رس کے بھرے ہوئے کوزے ہیں۔ اس لیے
لفظ شیرین سے بہت سی ترکیبیں بناتے ہیں جو ہماری زبان میں
بھی رائج ہیں مثلاً شیرین سخن۔ شیرین دہن۔ شیریں کلام۔ خواب
شیرین وغیرہ۔

بہرکیف اشرف صاحب کا یہ سفرنامہ فنّی اور ادبی دونوں حیثیتوں سے خوب ہے۔
خصوصاً ادبی حیثیت سے بہت اچھا ہے۔ اس کا کچھ حصّہ آپ نے دہلی ریڈیو اسٹیشن
سے نشر بھی کیا۔

غرض ماہنامہ ساقی آپ کی رشحات قلم سے وقتاً فوقتاً متمتع ہوتا رہتا ہے
چنانچہ ساقی ستمبر ۳۳ء "ناصر نمبر" میں "کچھ بھولی بسری باتیں" کے عنوان سے
ایک مضمون دیا ہے۔ اس میں خان بہادر میر ناصر علی مرحوم کے متعلق کچھ واقعات
ہیں جن کو لطائف و ظرائف سے دلچسپ بنایا ہے۔ ساقی "دلی نمبر" ۳۴ء میں
"غالب کی برسی" کے لیے اہل ہند کو توجہ دلائی ہے۔ جون آف آرک اور
شیکسپیر کی برسی جو منائی جاتی ہے ان کو گنایا ہے کہ پھر کیوں غالب جیسی ہستی

گوشۂ گمنامی میں پڑی رہے۔

ساقی سالنامہ جنوری ۱۹۳۵ء میں " ایران میں زرکاغذی کا پہلا تجربہ" کے عنوان سے اپنے تجربہ کی باتیں لکھی ہیں۔ زرکاغذی جسے عرف عام میں "نوٹ" کہتے ہیں اس کے ہر پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کی غرض و غایت بتائی ہے۔

"مذاہب ایران" کے عنوان سے قسط واری مضمون شاہجہاں میں دیتے رہے جو ۱۹۳۳ء میں دہلی سے نکلتا تھا۔ تقریباً دو سال ہوئے آپ دہلی سے خبریں بھی نشر کیا کرتے تھے۔ اور اس سلسلے میں حیدرآبادی سننے والے انھیں خطوط لکھتے۔ ان کی تقریر بہت پسند کی جاتی تھی۔ آپ کے "آداب عرض" کہنے کا طریقہ اتنا موثر تھا کہ آپ کا نام ہی سننے والوں نے "مولانا آداب عرض" رکھ دیا تھا۔

آپ نے اصلاح دیہات کے سلسلے میں تین ڈرامے لکھے ہیں۔ ان کی ایک ایک کاپی مجھے بھجوائی ہے۔ جو بحیثیت مجموعی قدیم رسوم کا ایک اصلاحی سرمایہ ہے۔ "ڈاکٹر صاحب" قصہ کی شکل میں تعلیم بالغان پر ایک مختصر مگر بے مثل کتاب ہے۔ اردو میں اس قسم کی یہ پہلی تصنیف ہے۔ ضخامت ۴۲ صفحے۔ "تریاہٹ اور دو ڈرامے"۔ ۶۸ صفحات کی ایک دلچسپ تصنیف ڈرامے کی شکل میں ہیں۔

"مبادی المعاشیات" معاشی نقطۂ نظر سے ایک کارآمد تصنیف ہے۔ انھیں عموماً دہلی کے دیہاتی پروگرام میں بدل بدل کر نشر کیا جاتا ہے۔

میرے مقالہ کے سلسلے کا آخری خط صاحب موصوف نے گاندھی آشرم وردھا سے لکھا تھا۔ لکھتے ہیں۔

"میں آج کل وردھا میں سیر کی غرض سے آیا ہوا ہوں۔ کل بلہار شاہ تک کوئلے کی کانیں دیکھنے گیا تھا۔ سُنا ہے کہ وہاں سے حیدرآباد کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ افسوس کہ میں حیدرآباد کی زیارت نہ کر سکا۔ اب میں آج شب کی ٹرین سے بمبئی جا رہا ہوں۔ وہاں سے ۳، ۴ روز بعد دہلی واپسی کا قصد ہے"۔

آزاد کی شکل و شمائل آزاد کی تصویر بہت عام ہے۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کے ظاہری محاسن میں سے انھیں کچھ نہ کچھ حصّہ ضرور ملا تھا۔ میانہ بلکہ پستہ قد۔ گندمی رنگ۔ چھریرا جسم تھا۔ پیشانی صفائے باطن کا آئینہ تھی۔ چہرے سے ذکاوت و فطانت ٹپکتی تھی۔ بشرہ سے کشادہ پیشانی۔ ہنس مکھ۔ نکتہ رس معلوم ہوتے ہیں۔ نگاہوں سے متانت رعب اور نور کی بارش ہوتی تھی۔ آنکھیں یوں بھی کیفیاتِ قلب کا آئینہ

ہوتی ہیں۔ ان کی آنکھوں سے ان کے ضمیر کا خلاصہ معلوم ہو جاتا تھا۔ زبان میں وہ جادو۔ باتوں میں وہ سہانا سحر اور مٹھاس۔ انداز بیان میں ایسی شگفتگی و گیرائی کہ صحبت میں کوئی تھوڑی دیر بیٹھے تو اس پر ایک محویت طاری ہو جائے۔

عادات و خصائل ان کی طبیعت قدرتاً موزوں تھی۔ وہ بلا کے ذکی اور ذہین تھے۔ بال کی کھال نکالتے تھے۔ بذلہ سنجی میں اپنا آپ جواب تھے۔ طبیعت کی شگفتگی نے انھیں ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ ان کی تقریر کا جادو سننے والوں کے قلوب کو موہ لیتا تھا۔ ان کی تحریر میں جو کشش ہے وہ ان کی تقریر کا عکس ہے۔ اسی ترنم و شعریت کا یہ ایک خوشگوار پرتو ہے جو جابجا اپنی جھلک دکھا کر دامن ادب کو مالا مال کر رہا ہے۔

طبیعت میں انتہائی غیرت تھی۔ ان کی تصنیفات کی شہرت و مقبولیت ان کی زندگی ہی میں ہو گئی تھی۔ لیکن ان کے دل کا سانچہ کچھ ایسا واقع ہوا تھا کہ اپنی کتاب کی تعریف تک خود سننا گوارا نہ تھا۔ گویا اپنے حالات کو دیکھ کر اپنے نفس کو موٹا نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"احمق کا قاعدہ ہے کہ اپنی تعریف سُن کر خوش ہوتا ہے۔"

میرا یہ حمق حد سے بہت گذر گیا ہے کہ تعریف سُن کر غصّہ آتا ہے۔ بات یہ ہے کہ آپ میری تصنیف کے باب میں کچھ نہ کہا کریں۔ کیا کہوں فرصت تو ہے نہیں۔ اور دل یہ چاہتا ہے کہ آپ کے ایک ایک فقرے کے جواب میں ایک ایک کتاب لکھوں۔"

ایک اور جگہ ان کی غیوری طبع کی جھلک دیکھیے۔ اپنے شاگرد لالہ دونی چند کو لکھتے ہیں۔

"میرا یہ حال ہے کہ جب ڈاکٹر صاحب آئے تو میں ان سے کالج ہی پر ملا۔ استقبال کو اسٹیشن پر نہیں گیا۔ اور طریقہ یہی رکھا ہے کہ گھر پر بے بلائے نہ جانا اور زیادہ اختلاط نہ بڑھانا۔"

ایک جگہ اور جل کر لکھا ہے۔

"مضحکہ بھی غیرت والوں کے لیے کچھ اثر رکھتا ہے صاحب بُہا بے غیرتی کے بھی بہادر ہیں۔ لالہ دونی چند! میں بیزار ہو گیا اس لیے کہ مایوس ہو گیا۔ اور میرا قاعدہ ہے کہ جب میں مایوس ہو جاتا ہوں تو بیزار ہو جاتا ہوں۔"

آزاد مرحوم کی طبیعت انتہا درجہ محنت پسند واقع ہوئی تھی۔ یعنی ان کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے کہ جس سے ان کے عیش و اطمینان سے بسر

کرنے کا دھوکا ہو سکے۔ ساری عمر ملک و قوم کی قلمی خدمت پر کمر بستہ رہے۔

مولوی عبدالحق صاحب میرے ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں۔

" آزاد زود رنج تھے۔ ان میں رشک و حسد بھی تھا۔ جب کسی کی طرف سے دل پر میل آجاتا تھا تو پھر نہیں نکلتا تھا۔ ایسا سنئے میں آیا ہے کہ بعض خانگی وجوہ ایسی تھیں کہ جن کی بناء پر وہ مومن سے خفا تھے۔ کچھ وجہ مذہبی اختلاف کی بھی تھی جب آب حیات شایع ہوئی تو مولانا حالی نے آزاد کو اس فروگذاشت کی طرف توجہ دلائی۔ جواب میں یہ لکھا کہ مجھے مومن کے حالات معلوم نہ تھے۔ اس لیے ان کا تذکرہ چھوڑ دیا۔ اگر آپ ان کے حالات لکھ بھیجیں تو آئندہ شایع کر دیے جائیں گے۔ آزاد کا یہ عذر بہت بھونڈا تھا۔ مولانا حالی نے کچھ واقعات لکھ کر بھیج دیے جس کا منشا یہ تھا کہ وہ انھیں اپنے رنگ میں ڈھال کر لکھ لیں گے۔ مگر آزاد نے بجنسہ وہ تحریر آب حیات میں درج کر دی۔ البتہ اس پر اپنی طرف سے شروع میں ایک نوٹ لکھ دیا۔ اس نوٹ میں " ایک الطاف فرما" کا جو فقرہ ہے۔ اس کا اشارہ الطاف حسین حالی کی طرف ہے "

اسی کی عالیجناب نواب صدر یار جنگ بہادر بھی اس طرح تائید فرماتے ہیں
مومن کا ذکر نہ کرنا ایک اجتہادی غلطی تھی۔"

مولانا محمد شفیع پروفیسر اورینٹل کالج لاہور فرماتے ہیں ۔

"میں نے ان کے بعض شاگردوں سے سنا ہے کہ ان کے
مزاج میں ظرافت بہت تھی۔ وہ لطائف جو میں نے سنے ہیں ان
سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ طلباء سے غایت درجہ بے تکلفی برتتے
تھے شگفتہ مزاج و رنگین طبع تھے۔"

طبیعت میں انتہائی نفاست تھی ۔صفائی کے خوگر تھے ۔ مزاج کی طرح لباس
میں بھی سادگی ان کا شیوہ تھا۔ بڑے وضعدار تھے ۔

مولانا آزاد کی انتہائی کسر نفسی اور منکسر المزاجی کا ثبوت ان کے
اس خط سے ملتا ہے جو انھوں نے حضرت ناصر نذیر فراق دہلوی کے نام
ان کی شاگردی اور اصلاح کلام کی درخواست پر لکھا ۔

"فقیر آزاد کے بارہ میں جو آپ نیک خیالات رکھتے
ہیں اور جو گراں بہا الفاظ اس کے حق میں آپ نے صرف فرمائے
ہیں وہ اپنے درجہ کو اس سے بہت پست سمجھتا ہے اور شکریہ اس کا
نہ زبان سے بیان کرسکتا ہے نہ قلم سے رقم کرسکتا ہے ۔شاگردی کا

ارادہ جو آپ نے تحریر فرمایا ہے وہ اپنے کو اس لایق نہیں
سمجھتا۔ علاوہ بریں استاد کو واجب ہے کہ شاگردوں کا حق
بھی ادا کرے اور اس کا جو حال ہے دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔
قسمیہ کہتا ہوں کہ اصلاً فرصت اصلاح نہیں ہے۔ امید ہے کہ
آپ معاف رکھیں گے۔"

یک دل و غیل آرزو دل بہ کجا کجا دہم   سینہ تمام داغ داغ پنبہ کجا کجا نہم

اس جواب صاف سے جس میں انکساری کوٹ کوٹ کر آزاد نے بھردی تھی
ناصر صاحب کی بہت دل شکنی ہوئی اور وہ آبدیدہ ہو گئے۔ ان کے والد
مرحوم نے یہ کہہ کر تسلی دی کہ مایوس مت ہو۔ اہل کمال کے بڑے دماغ ہوتے
ہیں ایک دفعہ میں اقرار کرلیا کریں تو ان میں اور عام آدمیوں میں کیا فرق
رہے۔ میں خود تمہیں لاہور لے چلوں گا اور خوش آمد درآمد سے۔ غرض جس
طرح بن پڑے گا تمھیں آزاد کا شاگرد کروادوں گا۔ حسن اتفاق کی بات
کہ ادھر لاہور کے منصوبے ہی ہوتے رہے کہ ایک دن مرزا یعسوب بیگ صاحب
نے اچانک آکر ان کے والد سے کہا مولانا آزاد دہلی میں تشریف رکھتے
ہیں۔ اور نواب پٹودی کی کوٹھی میں اترے ہیں۔ اس کو سن کر ناصر صاحب
کہتے ہیں "وہ خوشی مجھے آج تک یاد ہے"، شام کا وقت تھا ناصر صاحب

اپنے والد کے ساتھ درِ آزاد کی جبین سائی کو چلے۔ ان کے جاتے ہی آزاد تعظیم کو کھڑے ہو گئے۔ پس ناصر صاحب کے والد نے ناصر صاحب کا سر ان کے قدموں پر رکھ کر فرمایا۔ " یہ سر ایک حسینی زادہ کا ہے اس کی لاج رہے " اس جملہ کو سُن کر مولانا کانپ گئے اور اُنھیں سینہ سے لگا لیا۔ اور فرمایا " آپ نے یہ کیا غضب کیا۔ ہم تو آپ کے بزرگوں کا کلمہ پڑھتے ہیں " اس پر ان کے والد نے کہا " غضب تو آپ نے کیا کہ ایک کمسن سید زادہ کا دل توڑا کہ ہم تمھیں شاگرد نہیں کرتے " مولانا آزاد اس فقرہ کو سُن کر بہت پریشان ہوئے۔ اور فرمایا کہ " واللہ میں اس جملہ کو بالکل نہیں سمجھا " ناصر صاحب کے والد نے ان کی تحریر بتائی۔ بہت شرمندہ ہوئے۔ اپنی انتہائی عدیم الفرصتی کا اظہار کیا اور کہنے لگے " برائے خدا آپ معاف فرمائیں میں جب تک جیوں گا اس بے پروائی کی تلافی کرتا رہوں گا " اور پھر ان سے پتہ وغیرہ دریافت کیا۔ بہت دیر تک گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ پرانی صحبتوں، مناظرہ و مباحثہ کے جلسوں۔ حضرت ذوقؔ، غالبؔ اور مومنؔ کی پرلطف محفلوں کے تذکرے لال قلعہ کی آبادی کے قصے۔ غرض ایک دنیا جہان کی باتیں ہوتی رہیں۔ اسی صحبت میں ناصر نذیر فراق کو شرف تلمذ نصیب ہوا۔ ان کا کچھ کلام اور کچھ نثر وغیرہ دیکھ کر آزاد مرحوم

پھڑک گئے اور کہنے لگے "لیجیے جناب میر صاحب اب میرے اوپر بھی لازم ہو گیا ہے کہ میں اس سیدزادہ کو آزاد ثانی بنا دوں" اسی طرح سالہا سال تک اصلاح جاری رہی۔

ناصر صاحب لکھتے ہیں۔

"اگرچہ مجھے نظم و نثر میں سلیقہ پیدا نہ ہوا اور اب کیا ہو گا لیکن الحمد اللہ بے استادا نہیں ہوں۔ ایک کامل استاد کا دامن میرے ہاتھ میں ہے۔ اور اس کا مجھے بڑا فخر ہے"۔

کھانے کا شوق کھانے پینے میں انتہائی پاکیزگی برتتے تھے۔ کھانا بھی نہایت تمیز اور صفائی سے کھاتے۔ دسترخوان کی صفائی کا خاص طور پر لحاظ رکھتے۔ برتن وغیرہ ان کے سامنے میلے نہ آسکتے تھے۔ کھانے میں ذائقہ کا بہت خیال تھا۔ خوش خوراک تھے۔ سبز ترکاریاں بڑے شوق سے کھاتے۔ خصوصاً پودینہ کی چٹنی ان کے ہر کھانے پر ہوتی۔ گرمی میں تربوز اور برف بڑی پسند سے کھایا کرتے تھے۔ آم بھی انھیں بے حد پسند تھے۔ مولوی فرحت اللہ صاحب فرزند منشی ذکاء اللہ مرحوم نے اس ضمن میں بڑے دلچسپ حالات لکھے ہیں۔ مولانا کے تربوز کھانے کا طریقہ ہی نرالا تھا۔ بڑے اہتمام سے اس کو نوش جان کرتے۔ تربوز لانے والے سے

کہتے کہ صراحی لائیو اور صراحی بھی شہیدی ہو۔ یعنے بے حد سرخ اور شیریں۔ پھر اس کو بڑے تکلف سے تراش کر اس کی قاشیں ایک صاف ستھرے چینی کے پیالے میں ڈالتے۔ برف اور قند ملا کر کھاتے۔ نصف کھاتے اور نصف چھوڑ دیتے۔ تربوز کھا کر نمک اور کالی مرچیں بہت کھاتے تھے۔ یہ ان[1] کے جنون کا گویا آغاز تھا۔ جب کہ انھوں نے گوشت بھی کھانا چھوڑ دیا تھا۔ اس وہم میں کہ جانور کے بجائے مجھے آدمی کا گوشت کھلاتے ہیں۔ دہی انھیں بہت پسند تھا۔

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ان کی دیوانگی۔

آزاد کی دہلی کالج میں تعلیم

دہلی ایک جامع الصفات شہر تھا۔ آزاد کی تعلیم و تربیت دہلی کالج کے ادبی آغوش میں ہوئی۔ یہ وہی کالج ہے جہاں سے حالی۔ نذیر احمد۔ منشی ذکاء اللہ۔ ماسٹر پیارے لال آشوب جیسے باکمال لوگ پڑھ پڑھ کر نکلے اور انھوں نے آسمان ادب پر اپنی معرکۃ الآرا شخصیتوں سے چار چاند لگا دیے۔

یہ ادب کے ان سرستوں کے جتھے نے اس گتھی کو سلجھا دیا ہے کہ جہاں ادب ہے وہاں زندگی کا شباب ہے، زینت ہے، رعنائی ہے۔ دہلی کو ایک شمع سے تشبیہ دینا چاہیے جس کے حسن عالم افروز نے ایسے ایسے سربرآوردہ پروانوں کو متاثر کیا جن کے دم قدم سے اُردو ادب کا سکہ طول و عرض عالم پر بیٹھ گیا۔ اس کالج کے سلسلے میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ جب مسٹر کوپ نے مشرقی شعبے کی چار جماعتوں کو مضمون دیا۔ تو جہاں انگریزی میں موتی لال کا مضمون بہ لحاظ زبان اور بہ لحاظ طریقۂ بیان سب سے بڑھ کر رہا وہاں محمد حسین آزاد کا مضمون اُردو میں سب سے بہتر خیال کیا گیا۔ اس کو پڑھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ بہت سی معلومات اس میں ایسی کتابوں سے حاصل کی گئی تھیں

جو نصاب تعلیم میں داخل نہ تھیں اس کی وجہ یہ تھی کہ اس طالب علم کا تعلق دہلی گزٹ یا دہلی اُردو اخبار سے تھا۔ مطالعہ کی وسعت، عام معلومات کا ذخیرہ اتنا اس میں بھر دیا تھا کہ اس سے ان کی علمی پہنائی کا بخوبی اندازہ لگتا تھا۔ اور ایسی مفید معلومات بہم پہنچائی تھیں کہ جنھیں اُردو اخبارات و رسائل پڑھنے کی عادت ہو انھیں کا دامن ان پھولوں سے بھر سکتا ہے۔ اور ہر وقت ایک نئی دلچسپی پیدا کرنا تو آزاد کا ادنی کرشمہ تھا۔

آزاد کی آزادی آزاد واقعی اسم با مسمیٰ تھے۔ چمنستانِ ادب کے اس سروِ آزاد نے ہمیشہ سماج کے نمائشی ڈھکوسلوں سے اپنی زندگی الگ تھلگ بسر کی۔ کسی قسم کی ملکی یا قومی تحریک، انجمن، ایسوسی ایشن کے ممبر نہیں ہوئے۔ نہ کسی درباری مدح سرائی سے اپنے قلم کو آلودہ کیا۔ قومی و ملکی کام ان کی زندگی کی روحِ رواں تھے لیکن ان کی شہرت بہ حیثیت ایک قومی لیڈر یا کسی سوشیل مقرر کے نہیں ہوئی۔ ان کے علم و ادب کی شہرت ان کے کارناموں کی مقبولیت محض ان کے ذاتی جوہر اور اصلی معیار کی وجہ سے ہوئی۔ ہمیشہ نمود و نمائش سے پرے ہٹ کر اوقات بسر کی۔ قوم و ملک کی اصلاح کے لیے ان کا قلم ہمیشہ ہمیشہ رواں دواں رہا لیکن نام نہاد لیڈری اور نمائشی ممبرشپ کی پیچیدگیوں میں کبھی خود کو انھوں نے نہیں الجھایا۔

انھوں نے خود سرسید کے نام ایک خط[1] میں لکھا ہے۔

"میں اپنی تمام کوشش تمام طاقت وقت بلکہ اپنی جان و مال کو اپنے پیارے ہم وطنوں کے کام پر قربان کرنے تیار ہوں اور چاہتا ہوں کہ جو خیالات صلاح و اصلاح اور تہذیب و تعلیم کے رکھتا ہوں انھیں لکھوں اور پھیلاؤں طالب علمی سے یہی میرا ارادہ اور دلی آرزو تھی۔ مجھے ہرگز کسی ملکی یا مالی عہدہ کی طمع دامن گیر نہ ہوئی۔ شعر

خدا سے چاہتے ہم بھی تو تاج زر لیتے ۔۔۔ مگر ہوا نہ گوارا یہ بار سر لینا

عمر گراں بہا کا بڑا حصہ سررشتۂ تعلیم کی ابتدائی کتابوں کی تصنیف میں صرف ہوا۔ وہ کتابیں نام کو ابتدائی ہیں مگر مجھ سے انھوں نے انتہا سے بڑھ کر محنت لی۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ جب تک انسان خود بچہ نہ بن جاوے تب تک بچوں کے مناسب حال کتاب نہیں لکھ سکتا بڈھا ہو کر بچہ بننا پڑا۔ پھرتے چلتے سوتے جاگتے بچوں کے ہی خیالات میں رہا۔ مہینوں نہیں بلکہ برسوں صرف ہوئے جب وہ بچوں کے کھلونے تیار ہوئے۔ میں نے اہل وطن کی خدمت نہ کی ان کے بچوں کی خدمت کی۔"

---

[1] ۔ مکتوبات آزاد صفحہ ۱۸۹۔

دہلی کو خیرباد کہتے ہیں آزاد کا بچپن اور لڑکپن جتنا بے فکری و خوشحالی میں بسر ہوا اتنا ہی جوانی کا زمانہ پہاڑ کی طرح ان پر ٹوٹ پڑا۔ غدر کے وقت یہ بمشکل ۲۶، ۲۷ برس کے تھے کہ جلاوطنی نے قدم چومے اور یہ چل پڑے۔

لکھنؤ ہوتے ہوئے وہاں کے مشاہیر سے ملتے جلتے رہے۔ کچھ عرصے تک اطراف وجوانب میں سفر کیا۔ ایک مدتِ مدید کے بعد ۱۸۶۴ء میں تقدیر راہ پر آئی۔ اور آزاد لاہور پہنچے۔ یہاں پہنچ کر آپ سرکاری ملازمت میں داخل ہو گئے۔

آپ کی زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ لاہور ہی میں بسر ہوا۔ انجمن پنجاب کے جلسوں کا انھیں بانی کہنا چاہیے کہ انھیں کے دم قدم سے ان محفلوں کی رونقِ بازار قایم تھی۔

سفر دہلی کو کیا چھوڑا کہ پاؤں میں گردش پر کار آگئی۔ سفر ان کی زندگی کا ایک حصہ بن گیا۔ ۱۸۶۵ء میں بکار سرکار کلکتہ کا سفر کیا۔ پھر پنڈت من پھول کے ہمراہ کابل و بخارا گئے۔ ۱۸۸۳ء میں دوبارہ ایران کا سفر کیا واپس جب لاہور آئے تو پھر یہیں کے ہو رہے۔ پھر تو مر کے ہی اُٹھے۔

ملازمت جب آزاد واردِ پنجاب ہوئے تو پہلے پہل مولوی رجب علی صاحب کے پاس جگرانون میں مقیم رہے۔ پھر مولوی صاحب کے ذریعہ سے لفٹننٹ گورنر کے میر منشی پنڈت من پھول صاحب کے پاس آئے۔ اور منشی صاحب کی سفارش سے

لاہور میں ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم کے دفتر میں (۱۵) ماہوار کے ملازم ہوگئے۔ خستگی کے عالم میں یہ جگہ بھی ڈوبتے کو تنکے کا سہارا تھی۔

آزاد کی قسمت اس وقت جاگی جب ان کی رسائی اپنے قدیم ہم مدرسہ ماسٹر پیارے لال آشوب کے توسط سے محکمہ تعلیمات صوبۂ پنجاب کے میجر فلر کے پاس ہوئی۔ میجر کو عربی اور فارسی سے خاص دلچسپی تھی۔ اردو سے بھی وہ اچھی طرح واقف تھا۔ آزاد کو اس نے کسی لسانی شبہہ کو دور کرنے کی غرض سے بلوایا۔ ملنے کے بعد ان کی علمیت سے وہ بہت متاثر ہوا۔ اور اسی کے اثر نے آزاد کے لیے اردو اور فارسی کی درسی کتابیں لکھنے کی خدمت پیدا کی۔

شمس العلماء کا خطاب | وکٹوریہ کی جوبلی کے موقع پر انھیں ہندوستان میں سب سے پہلی مرتبہ شمس العلماء کا خطاب ملا۔ جس کے ساتھ گورنمنٹ کی طرف سے پانچ سو روپیہ سالانہ قلمدان کا خرچ ملتا تھا لیکن یہ انھوں نے نہیں لیا۔ اور اس رقم سے مستحق طالب علموں کو وظیفے دیے۔ اب تک گورنمنٹ کالج لاہور میں فارسی کے بہترین ایم۔ اے کو ایک نقرئی آزاد مڈل ملتا ہے۔

آزاد کا حافظہ | حافظہ بلا کا تیز تھا۔ مختلف موقعوں کے شعر جتنے انھیں یاد تھے کسی کو اتنے یاد نہ تھے۔ ان کا تذکرۂ آب حیات، جو اردو شاعری کی ایک پر لطف تاریخ، گھلاوٹ اور شیرینی کا ایک انمول سرمایہ ہے زیادہ تر ان کی

ذہنی یادداشت کا نتیجہ ہے۔

بیماری مکتوبات آزاد کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ آزاد نے بڑی سختیاں جھیلیں۔ بواسیر ایک کہنہ مرض بن کر انھیں لاحق ہوگئی تھی۔ مرض ہرنیا نے الگ ان کی صحت میں ایک غیر اطمینانی و بے کیفی پیدا کردی تھی۔ پھر ایران کے سفر میں اونٹ سے گر پڑنے کا سانحہ جس سے ان کی پسلی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ اس بے سروسامانی میں یہ واقعہ گزرا کہ صرف قدرت الٰہی نے جراحی کی۔ پسلی تو جڑ گئی لیکن گرہ رہ گئی تھی، جو مدت العمر باقی رہی۔

آزاد کی دیوانگی یہ آزاد مرحوم کی درخشاں زندگی کا نہایت عبرتناک پہلو ہے۔ اپنی اکلوتی صاحبزادی کے اچانک فوت ہوجانے سے وہ فاترالعقل ہوگئے تھے۔ اس صدمہ نے اتنا اثر کیا کہ ان کی صحت بھی بگڑ چلی اور دنیا سے بھی ان کا جی اچاٹ ہوگیا۔ ان کی دیوانگی کے بہت پہلے کا ذکر ہے کہ ان کا ایک دلچسپ مشغلہ تختی کے ذریعہ سے روحوں کو بلانا تھا۔ کچھ دنوں بعد اسے پھینک دیا۔ اور بغیر کسی خارجی مدد کے خود فرماتے کہ فلاں جگہ کی روح آئی ہے۔ پہلے خود کچھ سوالات کرتے۔ پھر کچھ دیر کے لیے خاموش ہو جاتے۔ پھر آپ ہی آپ تعجب کے لہجے میں کہنے لگتے "اچھا! تو یوں ہے" یہ سب باتیں اس وقت کی ہیں جب کہ یہ گورنمنٹ کالج لاہور میں لکچرار تھے۔ دوست

احباب سے میل جول قایم تھا۔ لیکن طبیعت میں ایک لٹک سی پیدا ہو چلی تھی۔ اور اکثر اوقات تنہائی میں آپ ہی آپ باتیں کیا کرتے۔ اسی عالم میں ایران کا سفر کیا۔ وہاں سے آئے۔ اکبری دروازہ کے باہر کتب خانہ آزاد کی بنیاد ڈالی۔ ظاہر میں یہ سب کچھ تھا لیکن باطن میں دوسرا ہی رنگ غالب رہتا تھا۔ بیٹی کی موت سے تو سارے اوسان جاتے رہے۔ دنیا سے جو تھوڑا بہت لگاؤ تھا وہ سب رفع دفع ہو گیا۔ دنیا کی بے ثباتی کا نقش، دل و دماغ پر ہمیشہ کے لیے بیٹھ گیا۔ ۱۸۸۴ء کے لگ بھگ لاہور میں ایک درویش سید دھیان شاہ چشتی تشریف لائے، جو کبھی سالک تھے کبھی مجذوب۔ پاس ہی نوین کوٹ میں قیام کیا۔ آنے جانے والوں سے صاحب سلامت بھی کر لیتے۔ لیکن بعض اوقات بالکل آپے سے باہر ہو جاتے اور خدا جانے کیا کیا سنا دیتے۔ عموماً لوگوں سے بات نہ کرتے تھے۔ مولانا کو بھی گردشِ تقدیر ادھر لے گئی۔ سید صاحب بہت محبت و شفقت سے ملے۔ جو کچھ نذرانہ یا پیش کش مولانا لے جاتے وہ قبول فرما لیتے۔ بعد چندے راز و نیاز کی محفلیں گرم ہونے لگیں۔ ان کا جو نتیجہ ہونا چاہیے تھا بہت جلد ظہور میں آ گیا۔ مولانا آزاد با ایں ہمہ علم و فضل، دیوانگی و وارفتگی کے ہم دوش ہو کر محبت کے کوچہ و بازار میں رسوائی کا تمغہ لگائے پریشانی کا ٹیکا باندھے،

جذبِ کامل کا علم ہاتھ میں لیے بآوازِ بلند یہ شعر پڑھتے ہوئے مارے مارے پھرا کرتے۔

اگر نئی کاہے گماں شک سے ملا گیری کا　　　رنگ لایا ہے ڈوپٹہ ترا میلا ہوکر

ایک دن مولانا کالج سے پڑھا کر نکلے تو بجائے گھر آنے کے نوین کوٹ چلے گئے۔ ابھی چند قدم کا فاصلہ تھا کہ سید صاحب نے نظر اٹھا کر دیکھا مسکرائے اور فرمایا "جا محمد حسین جا تیرے لیے دہلی کا حکم آیا ہے دلی چلا جا"

خدا جانے اس نگہ میں کیا جادو تھا، جس نے آزاد کو اپنا اسیر بنا لیا۔ گویا یہ بات جو سید دھیان شاہ کے منہ سے نکلی ایک بجلی تھی جس نے صبر و سکون، ہوش و حواس، تمدن و وضعداری، علمیت و تجربہ کاری سب کو چشم زدن میں جلا کر خاکِ سیاہ کر دیا۔ اس جسم خاکی میں وہ کیفیت کی لہر دوڑا دی جس کی ادنیٰ جولانگاہ دار و رسن ہے۔ صحرا نوردی اور دشت پیمائی جس کے ادنیٰ ترین کرشمے ہیں۔ الغرض ع

بہ مئے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغان گوید

کے بمصداق آزاد اسی وقت پیدل دلی کی طرف چل پڑے۔ پٹیالہ ہوتے ہوئے جنگل بیابانوں سے گزرتے ہوئے دلی پہنچے۔ مگر دیکھیے کس شان سے پہنچتے ہیں۔ عمامہ غائب، جوتا ندارد، حالم مپرس۔ تمام دلی میں شور

مچ گیا کہ محمد حسین آزاد اس صورت سے وارد شہر ہوئے ہیں۔ رشتہ دار
منتیں کرتے کہ چلیے ہمارے گھر چل کر رہیے۔ مگر وہاں سنتا کون تھا۔
کبھی قدم شریف، کبھی استاد ذوق کی قبر پر۔ کبھی شہر، کبھی جنگل جا نکلتے۔
بہت بھوک لگتی تو کسی دوکان سے مٹھی بھر چنے اٹھا لیے وہ بھی کئی کئی دن
بعد۔ آخر منشی ذکاء اللہ کے گھر آئے۔ جن کی دھن میں لاہور سے نکلے
تھے۔ وہیں ٹھکانہ بنایا۔ جس وقت آزاد منشی صاحب کے گھر پہنچے ہیں
صاحب موصوف تشریف نہ رکھتے تھے۔ جب باہر سے آئے اور سنا کہ آزاد
اس حالت کو پہنچتے ہوئے یہاں پہنچے ہیں اور ان کو دیکھا تو بے اختیار
رو دیے۔ ان کو کئی دن تک مہمان رکھا ہر قسم کی ناز برداری اٹھائی۔
دوستی میں وہ برتاؤ کیا کہ آج کل کے رشتہ داروں سے بھی یہ ناممکن ہے۔
تھوڑے دنوں بعد پھر محمد ابراہیم صاحب چند لوگوں کو لے کر دہلی آئے
اور انھیں سمجھا منا کر لے گئے۔

مرحوم کو منشی صاحب کے فرزندوں سے بھی دلی خلوص تھا۔ ان
بچوں سے بے حد محبت کرتے تھے۔ ان کے جنون میں بھی ایک ضابطہ موجود
تھا۔ مضمون لکھتے تھے اور دری کے نیچے چھپا دیتے تھے۔ مولوی فرحت اللہ صاحب
فرزند منشی ذکاء اللہ لکھتے ہیں کہ ہم ان کے مضامین جو وہ چھپا دیتے تھے

پڑھنے کی کوشش کرتے لیکن اس کے سمجھنے کے لیے ہماری عقل قاصر تھی کیونکہ ہماری عمریں دس دس بارہ بارہ سال کی تھیں۔ فرحت صاحب اکثر ان کے پاس جایا کرتے۔ وہ انھیں کانون دار کہہ کر بلاتے تھے۔ ان کا باقاعدہ کھانا ان کا انتہائی سلیقہ، ان کی فطری صفائی یہ ایسی چیزیں تھیں جن کو ان کا مختل دماغ بھی دور نہ کر سکا۔

اس عالم میں بھی تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری تھا۔ سیاک ونماک اور فلسفہ الٰہیات اسی دور کی یادگار ہیں۔ کیونکہ عالمِ جنون میں بھی صفائے باطن کی وجہ سے ان کا شغل یادِ خدا، عالم بے خودی اور الٰہیات تھا۔

اس زمانے میں یہ اپنی بیوی کے بھی دشمن ہو گئے تھے۔ کہتے تھے کہ میری بیوی مجھے آدمی کا گوشت کھلاتی ہے۔ اسی وہم میں گوشت کھانا بالکل ترک کر دیا تھا۔

انھیں[1] ایام میں ایک مرتبہ آپ رائے بہادر ماسٹر پیارے لال سے ملنے آئے دو تین گھنٹے تک ملاقات کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن بار بار یہی الفاظ ان کے وردِ زبان تھے "رائے صاحب آپ اس شعر کو پڑھا کیجیے۔ اس کے معنی آپ جو چاہیں سمجھ لیں۔

---

[1] اقتباس از سیر المصنفین جلد دوم صفحہ ۱۷۹۔

پردۂ درِ کعبہ سے اٹھا دینا ہے آساں پر پردۂ رخسارِ صنم اُٹھ نہیں سکتا۔

اس عالمِ دیوانگی میں بھی ان کی تحریر کا لطف انوکھا اور پیرایۂ بیان نرالا ہے۔ دیوان ذوق کے چھپنے کے بعد جب ایک کاپی ان کے پاس رکھی گئی اور خاتمہ لکھنے کی ان سے درخواست کی گئی پہلے تو کئی دن تک انکار کرتے رہے۔ لیکن آخر نہ معلوم کیا جی میں آیا کہ خود ہی قلم دوات لے کر ایک صفحہ لکھ دیا۔ جو دیوان ذوق کے خاتمہ پر درج ہے۔ اس میں اور صحتِ ہوش و حواس کی تحریروں میں کوئی بھی تو فرق نہیں البتہ اس میں تصوف اور الٰہیات کی چاشنی ملی ہوئی ہے۔ بقول مؤلف خمخانہ جاوید "اس بگڑی ہوئی حالت میں بھی جب کبھی قلم دوات کے نصیب کھل جاتے تھے تو عجیب عجیب گل فشانیاں کرتے کہ اب کوئی ذی ہوش ایسی گل کاریاں نہیں دکھا سکتا"

اصلاح کا واقعہ منشی ذکاء اللہ مرحوم سے آزاد کو انتہائی خلوص تھا۔ حد ہو گئی کہ ایک مرتبہ یہ ان سے ملنے پیدل لاہور سے دہلی آئے۔ اور اپنے گھر پر اطلاع تک نہ چھوڑی۔ منشی ذکاء اللہ نے ان کی بہت خاطر اور خدمت کی۔ اسی زمانے کا ذکر ہے کہ ایک دن منشی صاحب اصلاح بنوا رہے تھے کہ آزاد اس طرف اتفاق سے آ نکلے "یہ نائی خط بنانا کیا جانے میں بناؤں گا" یہ کہا اور نائی سے استرا لے کر خط بنانا شروع کر دیا کہ اتنے میں منشی صاحب مرحوم

کے ایک دیرینہ دوست ننھے خاں صاحب مرحوم آ گئے۔ وہ یہ واقعہ دیکھ کر ششدر و حیران ہو گئے۔ مگر خاموشی سے اس منظر کو دیکھا کیے۔ جب مولوی صاحب حجامت بنا کر فارغ ہو گئے۔ اور نائی کو استرا دے کر کمرے میں چلے گئے، تو ننھے خاں صاحب منشی صاحب سے کہنے لگے "واہ، واہ، خوب مولوی صاحب تو پاگل تھے ہی مگر تم ان سے بڑھ کر دیوانے ہو کہ ایک پاگل شخص کے ہاتھ میں استرا ہے اور تم نے اپنا گلا اور چہرہ ان کے سامنے کر دیا۔ اگر وہ تمہارا گلا کاٹ دیتے یا ناک اڑا دیتے تو میاں جب کیا کرتے۔ منشی صاحب یہ فقرے سن کر مسکرا دیے۔ اور بڑی متانت سے فرمایا۔ "بھئی جیسا ہمارا دوست پاگل ویسے ہم پاگل۔ ہم دونوں بچپن کے سچے دوست ہیں۔ وہ مجھ کو کبھی کوئی آزار نہیں پہنچا سکتے۔ سچی محبت ہر حالت میں یکساں رہتی ہے"۔

آلنٹ صاحب کا ذکر ایک دن مشن کالج جا پہنچے۔ وہاں پادری آلنٹ صاحب موجود تھے۔ ان سے ملے۔ ان کو کیا خبر کہ یہ پاگل ہو گئے ہیں انھوں نے ایک فلسفہ کی کتاب کا ترجمہ کرایا تھا وہ مولوی صاحب کو دکھایا۔ اور اس پر ان کی رائے پوچھی۔ مولوی صاحب نے بجائے کچھ کہنے سننے کے مسودہ کے چند اوراق پھاڑ پھوڑ پھینک پھانک وہاں سے چلتے بنے۔ پادری صاحب حیران کہ یہ کیا ان کی حرکت تھی۔ آلنٹ صاحب نے منشی

ذکاء اللہ مرحوم سے ان کی شکایت کی کہ نہ معلوم کیوں انھوں نے ایسی حرکت کی۔ منشی صاحب نے کہا کہ مولوی صاحب تو پاگل ہو گئے ہیں۔ یہ سُن کر آلنٹ صاحب کو بہت افسوس ہوا۔

آزاد کو دیوانگی میں دیکھنے والے اس کیف و استغراق کی حالت میں جن اصحاب کو ان سے شرف ملاقات نصیب ہوا ہے ان میں سے یہ قابل ذکر ہیں مولانا عبداللہ عمادی صاحب مترجم عربی سررشتۂ تالیف و تراجم جو اپنے کرم نامے میں ارقام فرماتے ہیں۔

"آزاد مرحوم سے پہلی مرتبہ سنہ ۱۹۰۴ء میں شرف نیاز حاصل ہوا تھا۔ اختلال کے باعث اگرچہ ذہنیت متغیر ہو چکی تھی تاہم افادات و استفادات کے کافی مواقع مل سکتے تھے۔ اختلال ذہن کے زمانے میں بھی دلی جاتے تو دن دن بھر استاد ذوق کی قبر پر گزار دیتے۔"

پروفیسر محمد شفیع اورینٹل کالج لاہور اپنے گرامی نامہ میں رقم طراز ہیں۔

"سنہ ۱۹۰۶ء میں جب میں لاہور بغرض تعلیم آیا تو مرحوم زندہ تھے۔ مگر جنون میں مبتلا۔ اس زمانے میں وہ سیر کے لیے باغوں میں نکلتے تھے۔ کئی بار میں نے ان کو دیکھا۔ سنہ ۱۹۰۷ء کے

ابتدائی مہینوں میں ایف ۔ اے کا امتحان قریب تھا اور میں
شیراں والی دروازے کے باہر ایک باغ میں فارسی کورس پڑھ رہا
تھا سکندر نامہ کا انتخاب اس نصاب میں شامل تھا۔ میں اس حصّہ کو
دیکھ رہا تھا کہ آزاد سیر کرتے ہوئے ادھر سے گزرے کسی شعر میں مجھ کو
اشکال کا سامنا تھا۔ میں ان کی طرف بڑھا اور سلام کرکے شعر کے
معنی پوچھے ۔ جہاں میں نے اس شعر کو پڑھا اُنھوں نے اس مقام
کے متعدد اشعار زبانی پڑھ دیے ۔ اور مطلب بھی بیان کیا دیوان
ابوالعتاہیہ (عربی) بھی نصاب میں داخل اور اس وقت میرے پاس
موجود تھا۔ اس میں سے میں نے ایک شعر پوچھا جس میں " سلیم "
(بمعنی لدیغ) آیا تھا۔ فرمایا اس لفظ کے معنی یاد نہیں ۔ ہمارے ہاں
آؤ لغت میں دیکھ کر بتائیں ۔ وہ اکثر باغوں میں گھومتے رہتے۔ چلتے
چلتے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ سے باتیں کیے جاتے ہیں ۔"

مولانا حسن نظامی صاحب دیباچۂ مکتوب آزاد میں لکھتے ہیں :۔

" آخری ایام میں جب استاد عالم استغراق میں تھے اور دیوانی
دنیا ان کو دیوانہ کہتی تھی میری نظروں نے بھی دیکھا ۔ ڈاکٹر غلام نبی
زبدة الحکماء کی کوٹھی میں بیٹھا تھا، جو شہر لاہور کے باہر واقع ہے۔

دیکھا ایک سفید ریش بزرگ سفید عمامہ باندھے لکڑی ہاتھ میں لیے
خراماں خراماں چلے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا یہی آزاد
ہیں۔ بے تاب ہوکر دوڑا کہ زیارت کا شرف حاصل کروں۔ وہ
تیزی سے چلتے گئے مگر ہمت کرکے اُن کے قریب پہنچ گیا۔ تعاقب نے
پہلے تو ان کو تیز خرام کردیا تھا قریب دیکھا تو ٹھہر گئے۔ اور مڑکر
دیکھا۔ میں نے جھک کر سلام کیا۔ انھوں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر
دعا کی۔ اللہ تم کو خوش رکھے کہ مجھ جیسے آدمی کو سلام کرتے ہو۔
میں نے عرض کیا۔ زیارت کا بے حد اشتیاق تھا۔ فرمانے لگے لعنت
ہے اس شخص پر جس نے تم کو میرا مشتاق بنایا۔ یہ کہا اور پوری
تیزی سے روانہ ہوگئے یہ پہلی ملاقات تھی۔ اور یہی آخری کہ اس
کے بعد پھر کبھی دیدار میسر نہ آیا۔"

آزاد کے متعلق یہ خواجہ صاحب کا خیال ہے جن کو "مصور فطرت" کہتے ہیں۔
ان کا پر لطف انداز میں لکھا ہوا دیباچہ دیکھ کر میں نے انھیں خط لکھا اور ان کے
کچھ حالات پوچھے تو حضرت نے اس ایک ہی جملے سے میرا منہ کیل دیا۔

"میں حضرت آزاد دہلوی کے ذاتی حالات بالکل نہیں جانتا
ورنہ تعمیل ارشاد کرتا۔"

ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی نبسۂ میر دردؔ مرحوم کی ایک دلچسپ
روایت سے جو مکتوب آزاد میں حسن نظامی صاحب کے دیباچہ کے بعد واقع ہے
آزاد کی مجنونانہ زندگی پر کچھ روشنی پڑتی ہے فرماتے ہیں :-

"سنہ ۱۹۰۹ء میں یکایک خیال آیا کہ ایک بار لاہور چل کر مولٰنا
کی زیارت پھر کر لو۔ ایسا نہ ہو خدانخواستہ مولٰنا اس جہان سے
رحلت کر جائیں۔ اور یہ آنکھیں آخری دیدار سے بھی محروم رہیں! اس
خیال کا آنا اور میرا ۲۱ر مارچ جمعہ کو لاہور چل دینا۔ انارکلی محمد شفیع
کی سرا میں ٹھہرا۔ ۱۳ر مارچ اکبری دروازہ مولٰنا آزاد کی دولت سرا
پر پہنچ گیا ایک پنساری مولٰنا کے امام باڑہ کے نیچے ہی دوکان میں
بیٹھتا ہے میں نے اس سے پوچھا آغا محمد ابراہیم صاحب کہاں ہیں۔
اس نے کہا وہ تو جگراؤں ہیں۔ میں نے کہا ان کے کوئی صاحبزادہ
کہا آغا محمد یوسف گھر میں ہیں۔ پھر میرے دستک دینے پر آغا محمد یوسف
مرحوم کوٹھے پر سے نیچے اُتر آئے۔ وہ مجھے کیا پہچانتے۔ دیکھا نہ بھالا۔
پھر میں نے اپنا مدعا سنایا کہ آپ کے دادا جان کی قدمبوسی کے لیے دہلی
سے آیا ہوں۔ فرمایا امام باڑہ میں بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں۔ ہم دونوں
ساتھ ساتھ گئے استاد امام باڑہ کے برآمدہ میں بیٹھے تھے اور جس

ہئیت سے بیٹھے تھے اسے دیکھ کر میرا کلیجہ منہ کو آگیا۔ایک میلی سی اچکن گلے میں تھی جس کی چولی میں پورے بٹن بھی نہ تھے۔ایسا ہی میلا کچیلا ڈبل زین کا پیجامہ تھا۔سر پر مغلئی وضع کی چکٹ ٹوپی اور پاؤں میں بہت ہی بوسیدہ جوتی تھی ایک بوریہ پر بیٹھے تھے۔ایک مٹی کی رکابی میں شوربا تھا اور ایک چنگیر میں چپاتیاں تھیں چپاتی کا نوالہ بنا کر شوربے میں ڈبوتے تھے اور اسے منہ میں رکھ لیتے تھے۔ اور دیر تک چبا کر مشکل سے نگل جاتے تھے۔بوریہ کے اِدھر اُدھر کچھ راکھ کچھ کوئلے اور کچھ کوڑا پڑا تھا[1]۔میں نے کہا سبحان اللہ یہ وہی منظر ہے جو حضرت نے آب حیات میں سید انشاء اللہ خاں کے آخری دور میں لکھا تھا۔مجھے دیکھ کر فرمایا تم کون ہو۔میرے نام بتانے پر فرمانے لگے "بھئی میں تمھیں نہیں پہچانتا"۔ میں نے کہا میں آپ کا شاگرد ہوں۔ فرمایا اچھا اگر تم میرے شاگرد ہو تو

---

[1] ۔ خدا کی شان یہ وہی آزاد ہیں جو آب حیات میں اپنی رنگین بیانی اور نفاست طبع سے مجبور ہو کر حکیم آغا جان عیش کے لیے لکھتے ہیں۔ ان کی سرخ و سفید رنگت پر گلے میں ململ کا کرتا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے چمبیلی کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہے۔

(مضمون نگار)

گرما گرم جلیبیاں تو لے آؤ میں نے اسے بڑی سعادت سمجھی ۔
دوڑا دوڑا گیا۔ گرم جلیبیاں تو نہ ملیں ٹھنڈی لایا اور سامنے
رکھ دیں۔ ایک جلیبی اٹھائی اور فرمایا بھلا میرے ہلتے ہوئے
دانتوں سے ٹھنڈی جلیبیاں کب کھائی جائیں گی۔ اچھا اٹھالو۔
میں نے اصرار کیا تو بگڑنے لگے۔ آغا محمد یوسف نے کہا زیادہ نہ
کہیے نہیں تو برا بھلا کہیں گے۔ پھر کہا اچھا جاؤ یہاں سے۔
میں اور آغا صاحب امام باڑے کے صدر دروازہ میں آکر
ایک تخت پر بیٹھ گئے۔ آغا صاحب نے پان سے تواضع فرمائی
پھر میں نے مولانا کی زدہ حالت پر اظہار افسوس کیا اس پر
آغا صاحب نے فرمایا، حضرت گور کا عذاب مردہ ہی خوب
جانتا ہے۔ اگر دسترخوان میں روٹی لائی جاتی ہے تو دسترخوان
جلا دیتے ہیں چینی کی رکابیوں میں سالن دیا جاتا ہے تو انھیں
توڑ کر پھینک دیتے ہیں۔ تانبے کی رکابیاں دیجیے تو بازار
میں جاکر بیچ آتے ہیں یا کسی راہ چلتے کو دے دیتے ہیں،
سیکڑوں برتن غارت ہو چکے۔ اچھے اور ستھرے کپڑوں سے
بیر ہے۔ ادھر پہنائے ادھر پھاڑے۔ اتنے میں کیا دیکھتا

ہوں کہ خلال کرتے ہوئے امام باڑہ ہیں سے چلے آتے ہیں مجھے دیکھ کر فرمایا ہیں بھئی تم کب دلی سے آ گئے۔ واللہ میں نے تمھیں اس وقت نہیں پہچانا تھا۔ یہ کہہ کر تخت کے تکیے کا سہارا لے کر بیٹھ گئے۔ مسکرانے لگے۔ میں نے کہا آپ نے مجھے پہچان لیا۔ فرمایا، ہاں میاں تمھارا نام سید ناصر نذیر ہے۔ اس بات کو سن کر میں نہایت خوش ہوا اور آغا یوسف بھی حیران ہو گئے۔ میں نے حضرت کے مزاج کو راہ پر دیکھ کر کہا۔ میں نے ایک تازہ سلام کہا ہے وہ سنانا چاہتا ہوں۔ فرمایا پڑھو۔ میں نے سلام پڑھنا شروع کیا۔ جو شعر پسند آتا تھا اس پر خوش ہو کر فرماتے تھے یہ خوب کہا ہے اور جو پسند نہ آتا تو فرماتے یہ کچھ نہیں۔ جب میں نے سلام کا مقطع بھی پڑھ دیا تو فرمایا تمھارا سلام تو بہت ہی اچھا ہے مگر کہیں کہیں جو میں نے یہ کہہ دیا تھا کہ یہ کچھ نہیں۔ یہ شعر کی بندش کے لحاظ سے کہا ہے۔ میں نے کہا درست ہے۔ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ مگر کبھی کبھی بے ڈھنگے پن کی بھی کہہ جاتے تھے۔ پھر یکایک اُٹھے اور بازار کے طرف چل دیے۔ پھر زندگی میں مولانا کو دیکھنا نصیب نہ ہوا۔“

سنا ہے کہ انہیں ایام بے خودی میں ایک روز مولٰنا نے بہت سے مسودات کا پلندہ اٹھالیا اور دریا برد کر آئے ۔

وفات | آخر اسی حالت بے خودی محویت وجنون میں ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء مطابق ۹ محرم الحرام ۱۳۲۸ھ کو حضرت آزاد قید ہستی کی صعوبتوں سے آزاد ہو گئے ۔ حضرت کیفی دہلوی لکھتے ہیں ۔

"جس طرح وینس کو بائیرن کی آخری آرام گاہ ہونے کا فخر حاصل ہے اسی طرح لاہور کو ان کی جائے مزار ہونے کا اعزاز رہے گا ۔"

آزاد کی قبر بھاٹی دروازہ کے باہر گامے شاہ کی کربلا میں واقع ہے یہ مقام گورنمنٹ کالج کے پاس داتا گنج بخش کے مزار کے متصل ہے ۔ یہاں پر آزاد اکثر سیر کرنے آتے تھے اور یہ جگہ انھیں بہت پسند تھی ۔

قبر پر ایک چھوٹا سا گنبد سنگ مرمر کا ہے ۔ جس پر سنہری کلس بہت خوشنما معلوم ہوتا ہے ۔ مزار پر سید محمد محسن صاحب متین کا تصنیف کردہ قطعۂ تاریخ کندہ ہے ۔ اس اُردو کے مسیحا کی تاریخ رحلت حکیم سید ناصر نذیر فراق دہلوی نے یہ کہی ہے :۔

حضرت آزاد والا مرتبت　　　چون ز دنیا کرد ناگہ رو بہ خلد

حوریاں را شادمانی در گرفت | جشن فرخ کردہ شد ہر سو بہ خلد
کاملے از شہر دہلی در رسید | سکۂ خود می زند اُردو بہ خلد
اللہ اللہ حُلّۂ استادِ من | می فشاند دم بدم خوشبو بہ خلد

بہر تاریخ وصالش از فراق
عرشیاں گفتند رفتہ او بہ خلد
۱۳۴۸ھ

مولانا حالی نے بھی تاریخ وفات لکھی تھی جس کے اشعار یہاں درج کیے جاتے ہیں:۔

آزاد وہ دریائے سخن کا دُرِ یکتا | جس کی سخن آرائی پہ اجماع تھا سب کا
ہر لفظ کو مانیں گے فصاحت کا نمونہ | جو اس کے قلم سے دم تحریر ہے ٹپکا
ملکوں میں پھرا مدتوں تحقیق کی خاطر | چھوڑا نہ دقیقہ بھی کوئی رنج و تعب کا
دیکھا نہ سنا ایسا کہیں اہل قلم میں | تصنیف کا۔ تدوین کا۔ تحقیق کا لپکا
صحت میں، علالت میں، اقامت میں، سفر میں | ہمت تھی بلا کی تو ارادہ تھا غضب کا
فرض اپنا ادا کر کے کئی سال سے مشتاق | بیٹھا تھا کہ آئے کہیں پیغام طلب کا
آخر شب عاشور کو تھی جس کی تمنا | آ پہنچا نصیبوں سے بلاوا اسے رب کا

تاریخ وفات اس کی جو پوچھے کوئی حالی
کہہ دو کہ "ہوا خاتمہ اردو کے ادب کا"

اساتذہ اور احباب

ذوق سے تلمذ | یوں تو انشا پردازی کا چسکا آزاد کو اپنے کالج کی دیواروں کے اندر ہی پڑ چکا تھا۔ اپنی جماعت میں سب سے اول رہنا ان کا پیدائشی حق تھا۔ دیوان ذوق اور دیباچۂ آب حیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوق نے آزاد کی طبع رسا اور ذہن خدا داد کو خوب پرکھ لیا تھا۔ آزاد، ذوق کے سب سے زیادہ ہونہار اور چہیتے شاگرد تھے۔ ذوق کو آزاد سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں اور حقیقت میں آزاد نے ان کی امیدوں کو حد سے زیادہ پورا کر کے دکھا دیا۔

مولوی محمد باقر کا بچپن سے شیخ محمد ابراہیم ذوق سے کچھ ایسا خلوص تھا کہ یہ دوستی آج کل کے رشتوں سے زیادہ مضبوط و مستحکم ہو گئی تھی۔ اس لحاظ سے ذوق آزاد کو اپنا حقیقی بھتیجا سمجھتے تھے۔ یوں بھی آزاد کو طالب علمی کے زمانے سے ہی اپنے استاد کے اشعار کو اپنی بیاض میں لکھنے کا شوق تھا۔ اس کے علاوہ وہ ذوق کا کلام جہاں کہیں بھی پاتے تھے صندوقِ سینہ میں محفوظ کرتے جاتے تھے۔ ان سے زیادہ اور تو اور خود ذوق کے

پاس بھی ان کے کلام کا مجموعہ نہ تھا۔

ذوق کی شخصیت نے ان پر عمیق اور وسیع نقش چھوڑا تھا۔ جب وہ ان کا ذکر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے پیر و مرشد کا بلکہ اپنے دیوتا کا ذکر کرتے ہیں۔ آب حیات میں ان کے حالات کیا لکھے ہیں بلکہ ذوق کے پرستش کا سامان فراہم کر دیا ہے۔ دیوان ذوق کا دیباچہ اس انتہائی محبت کی شہادت کے لیے ایک مستند سند ہے۔

آزاد نے آنکھ کھولتے ہی ذوق کو دیکھا۔ انہیں کے سایۂ عاطفت میں تعلیم و تربیت پائی۔ ذوق تھے تو آزاد کے استاد لیکن محبت و شفقت کے لحاظ سے ان کے احباب میں سے تھے۔

حکیم آغا جان عیش سے تکمیل ادب

ذوق کے مرنے کے بعد حکیم آغا جان عیش کے فیض صحبت سے فائدہ اٹھایا۔ بقول مولنا عبداللہ عمادی صاحب

"ادب کی تکمیل آغا جان عیش سے ہوئی۔ مگر عہد طفولیت استاد ذوق کے زیر سایۂ تربیت بسر ہوا۔ اس لیے عمر بھر یہ ذوق نہ گیا"

حکیم آغا جان عیش

آزاد نے ان کو پہلی مرتبہ ذوق کے ساتھ مشاعرہ میں

دیکھا تھا۔ اس تصویر کو آنکھوں میں رکھا۔ استاد کے مرنے کے بعد ذوق سخن نے آزاد کو ان کے حضور میں پہنچا دیا۔ گو حکیم صاحب ذوق کے ہم پلّہ نہ تھے تاہم ان کے اہلِ کمال ہونے میں کچھ شبہ نہ تھا۔ آب حیات صفحہ ۴۸۲ میں آزاد نے ان پر ایک نوٹ دیا ہے۔ ان کا حلیہ لکھتے ہوئے لباس کا ذکر کرتے ہیں۔

"گلے میں ململ کا کرتا جیسے چمبیلی کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہے۔"

آغا محمد اشرف بھی حکیم صاحب کے تلمذ کی اس طرح تائید کرتے ہیں۔

"کالج کی تعلیم ختم کرنے کے بعد گھر کے چھاپہ خانے اور اخبار کا کام سنبھالا۔ اتنے میں استاد ذوق کا انتقال ہو گیا۔ پھر یہ دہلی کے ایک اور استاد حکیم آغا جان عیش کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔"

احباب ان کے دوست بہت کم تھے لیکن جتنے تھے ان سے بے حد تعلقات تھے۔ مکتوبات آزاد دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اُنھوں نے کس قسم کے خط لکھے ہیں اور کن کن کو لکھے ہیں۔ مثلاً منشی ذکاء اللہ صاحب سے ان کا خلوص کہ آزاد لاہور سے پیدل ان سے ملنے دلی آئے۔

شمس العلماء خان بہادر مولوی منشی ذکاء اللہ صاحب دہلی کی ان مایۂ ناز ہستیوں میں سے ہیں جن پر مسلمان ہزاروں سال فخر کریں گے۔ آپ مولانا

آزاد کے ہم درس اور ہم راز دوست تھے۔ آپ دہلی کے بہت مشہور ریاضی کے ماہر تھے۔ پیدائش کا سنہ ۱۸۳۲ء ہے۔ اس لحاظ سے آزاد ان سے صرف ۲ سال کے بڑے تھے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دہلی کالج میں داخل ہوئے۔ مختلف موضوعات پر ان کی تصانیف ہیں مثلاً ریاضی، تاریخ جغرافیہ، سیاست مدن، علم اخلاق وغیرہ۔ ان کی تعداد (۱۴۳) ہے جو ۱۸۵۴ء سے لے کر ۱۹۱۰ء تک کی کمائی ہے۔

ان کی طبیعت ہمہ گیر واقع ہوئی تھی۔ ہر مضمون پر روانی و عالمانہ روش سے بے تکان لکھ سکتے تھے۔ ان کی اس وسعتِ معلومات کو دیکھ کر مولانا حالی نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ:-

"آپ کا دماغ بنیے کی دُکان ہے۔ جس کو جس چیز کی
ضرورت ہوئی وہاں سے مل گئی"

نہایت کریم النفس، وسیع الاخلاق، فیاض طبع اور روشن دماغ تھے۔ ان کے فرزند مولوی عنایت اللہ صاحب حیدرآباد میں دارالترجمہ کے ناظم رہ چکے ہیں اور اب کچھ عرصہ سے ڈیرہ دون میں سکونت اختیار کرلی ہے۔ مرحوم کے اور دو فرزند مولوی رضاء اللہ صاحب و فرحت اللہ صاحب دہلی میں مقیم ہیں۔ منشی صاحب مرحوم کا انتقال ۷، نومبر ۱۹۱۰ء دہلی میں ہوا۔

میجر سید حسن بلگرامی آپ نواب عماد الملک مرحوم کے چھوٹے بھائی تھے۔ عربی، فارسی، اُردو اور نثر کی زبان کے لاثانی ادیب تھے۔ اور قومی درد رکھنے کی وجہ سے سر سید مرحوم کے ساتھ خاص تعلقات رکھتے تھے۔ ۱۹۱۳ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۱۵ء میں انتقال کیا۔

حکیم محمد دین صاحب لاہور سے ملا ہوا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے وہاں کے رہنے والے تھے۔ علمی و ادبی ذوق اس قدر تھا کہ رات دن تحصیل علم میں ہی مصروف رہتے تھے۔ علم کیمیا کا شوق حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا۔

مولٰنا سید ممتاز علی مرحوم ان سے بھی آزاد مرحوم کے گہرے تعلقات تھے۔ ان کے فرزند سید امتیاز علی صاحب تاج میرے خط کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"پروفیسر آزاد سے والد ماجد کے بہت زیادہ تعلقات تھے لیکن دونوں میں خط و کتابت کبھی نہیں ہوئی۔ اور ہوتی کیونکر۔ دونوں لاہور ہی رہتے تھے۔ اور تقریباً روز کا ملنا جلنا تھا۔ ایسی صورت میں خط و کتابت کا کوئی موقع نہ تھا۔"

انہیں تعلقات کی بناء پر مولٰنا نے آزاد کی دربار اکبری اپنے زیر اہتمام طبع فرمائی اور اس طرح حقِ دوستی ادا کیا۔

ڈاکٹر لائٹنر ایک صاحب بہادر تھے پہلے گورنمنٹ کالج کے پرنسپل تھے۔ پھر ڈائرکٹر رہے۔ پھر یونیورسٹی کے رجسٹرار ہو گئے۔ اول اول مولنٰا آزاد پر بہت مہربان تھے۔ پھر خفا ہو گئے۔ پھر من گئے۔ آخر ۱۸۶۶ء میں سنٹرل ایشیا میں پولٹیکل خدمات پر بھی گئے تو مولنٰا کو ساتھ لے گئے۔ تاریخ سین اسلام بڑی محنت سے لکھوائی تھی۔ مگر ایک دفعہ سے دوبارہ نہ چھپ سکی۔ اچھی چیز تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے نام نے مولنٰا کی محنت کو خاک میں ملا دیا۔ اگر مولنٰا خود اپنے نام سے چھپواتے تو کئی بار چھپ چکی ہوتی۔

شاگردوں سے تعلقات آج کل عام طور پر طلباء اور مدرسین میں وہ عقیدت و شفقت ناپید ہے جن سے آزاد کے شاگرد دوچار ہوئے۔ وہ صدہا نوجوان جن کو گورنمنٹ کالج لاہور میں آزاد سے شرفِ تلمذ حاصل ہوا تھا، ان سب کو اسی نظر سے دیکھتے تھے۔ جس نظر سے افلاطون ارسطو کو، مرزا غالب تفتہ کو اور مومن کی شیفتگی شیفتہ سے تھی۔ اکثر شاگرد تو ان کے ایسے تھے جنھوں نے باوجود فارغ التحصیل ہونے کے حصول معیشت میں ان سے معقول استمداد حاصل کی۔ اس سے ان کے عادات و خصائل کی خوبی کا بخوبی اندازہ لگتا ہے۔ شاگردوں کی گرویدگی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ استاد کا خلوص کس درجہ پر پہنچا ہوا تھا۔ نیز ان کے خطوط سے

معلوم ہوتا ہے کہ اپنے شاگردوں سے بہت محبت کرتے تھے اور ہر طرح ان کی مدد کرنے پر کمربستہ رہتے تھے۔ چنانچہ مکتوبات آزاد میں ان کے ایک شاگرد لالہ دونی چند وکیل، جو بعد میں پنجاب کانگریس کے لیڈر ہو گئے تھے، ان کو ملازمت دلوانے کے لیے آزاد بار بار افسروں سے ملے اور آخر کار انھیں نائب تحصیلدار نامزد کروا دیا۔ ان کے علاوہ ان کے اکثر شاگرد ان سے وظیفہ پاتے تھے جو انھوں نے کبھی واپس نہیں لیا۔

حکیم ناصر نذیر فراق دہلوی ان کی شاگردی کا حال ان کی دیوانگی کے باب میں بصراحت درج ہے۔

آزاد کی تصانیف

ذیل میں شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد کی تصانیف کی جو اس وقت تک شایع ہوکر مقبول عام ہو چکی ہیں مکمل فہرست دی جاتی ہے۔ یہ فہرست اس لیے درج کی جاتی ہے کہ جو نمونے اس سے قبل دیے گئے ہیں وہ محض آزاد کی تصانیف کے دریا کے چند قطرے ہیں مکمل آزاد اپنی مکمل تصانیف کے بغیر نہیں مل سکتے۔ بہرکیف ہم آزاد کی تصانیف کو ادبی نقطہ نگاہ سے تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) جو ابتدائی درجوں کے لیے درس و تدریس کی خاطر مخصوص ہیں۔
(۲) جو موصوف کی ادبی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔
(۳) جو خللِ دماغ کے زمانے کا سرمایہ ہیں۔

زمانے کے لحاظ سے بھی نظم و نثر کے علاوہ موصوف کی تصانیف دو حصوں میں تقسیم ہو سکتی ہیں۔ ایک وہ جو ان کے زمانۂ حیات میں چھپ چکی ہیں اور دوسری وہ جو ان کی حیات کے بعد طبع ہوئیں اس کا حال مختصر نوٹ میں دکھایا جائے گا۔

مولانا کی قدر ان کے معاصرین شبلی، سرور، سرسید، نذیر احمد، ذکاء اللہ
حالی، آشوب، وغیرہ کی نگاہ میں شاعر و ناثر دونوں حیثیت سے بہت زیادہ
تھی۔ جس میں مولانا کی تقریر کی انشا پردازی بھی حصہ رکھتی تھی۔ شبلی نے تو
جوشِ عقیدت و محبت سے بے چین ہو کر آزاد کو مجدد شاعر اور ادیب کے ساتھ
"خدائے اردو" کہہ دیا ہے۔ کچھ بھی ہو آزاد "ناخدائے اردو" ضرور ہیں۔

(۱)

پہلی صنف کی کتابیں حسبِ ذیل ہیں :-

اُردو		فارسی	
(۱) اُردو کا قاعدہ	ابتدائی جماعتوں کے لیے	(۱) فارسی کی پہلی	ابتدائی جماعتوں کے لیے
(۲) اُردو کی پہلی		(۲) فارسی کی دوسری	
(۳) اُردو کی دوسری		(۳) جامع القواعد	اعلیٰ مدارج کے لیے
(۴) اُردو کی تیسری			
(۵) اُردو کی چوتھی			
(۶) قصص ہند			

ان کتابوں کی مشترک خوبیاں یہ ہیں :-

(۱) زبان نہایت سادہ مطالب آسان اور طرزِ تحریر دلچسپ ہے۔

(۲) سادگی اور دلچسپی برابر بڑھتی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ بچے آسانی اور شوق کی وجہ سے استاد کی مدد کے بغیر بھی آگے کا سبق پڑھ کر سمجھ لیتے ہیں اور تیار کر لیتے ہیں۔

(۳) اُردو کی تعلیم کے لیے آزاد کی ان کتابوں کے پہلے طلباء کے لائق ایسی مرتب آسان اور دلکش کتابیں نہ تھیں مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کی اُردو کی پہلی، دوسری، تیسری، چوتھی اور پانچویں کتابیں بہت بعد لکھی گئی ہیں۔

ان کتابوں کی ہمہ گیر مقبولیت کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ پنجاب ٹکسٹ بک کمیٹی نے ان سب کو منظور کر لیا اور اب تک بعض کتابیں داخل نصاب ہیں۔

مندرجۂ ذیل کتب پر مقالۂ ہٰذا میں تنقید کی گئی ہے۔

۱۔ نیرنگ خیال (۲ جلد) .... سنہ ۱۸۸۰ء

۲۔ آب حیات .... سنہ ۱۸۸۳ء

۳۔ مکتوبات آزاد .... سنہ ۱۸۸۷ء

۴۔ دیوان ذوق .... سنہ ۱۸۹۰ء

۵۔ دربار اکبری .... سنہ ۱۸۹۸ء

۶۔ سخندان فارس .... سنہ ۱۹۰۷ء

۷۔ نگارستان فارس ۱۹۲۲ء

۸۔ سیر ایران

۹۔ فلسفۂ الٰہیات ۱۹۲۲ء

۱۰۔ سپاک و نماک ۱۹۲۷ء

۱۱۔ نصیحت کا کرن پھول

۱۲۔ نظم آزاد ۱۸۹۹ء

ان کے علاوہ آزاد مرحوم کی یہ کتابیں بھی ہیں۔

۱۔ ڈرامۂ اکبر (جلال الدین محمد اکبر شہنشاہ ہند کے نورِ نظر جہانگیر و نور جہاں کے افسانۂ محبت کو سب سے پہلے ڈرامہ اُردو کا لباس پہنا کر پیش کیا ہے ۱۹۲۲ء)۔

۲۔ نعت آزاد

۳۔ بیاض آزاد

۴۔ آموزگار پارسی

۵۔ جانورستان

۶۔ کائنات عرب

۷۔ تذکرۂ علماء

۸۔ قواعد اُردو

۹۔ خمکدۂ آزاد

آب حیات آب حیات آزاد کا ایک مہتم بالشان اور لافانی شاہکار ہے۔ جس کی ضخامت ۵۵۲ صفحے ہے اس تذکرہ میں شعراء اور مصنفین کے حالات بھرے پڑے ہیں مگر شعراء کے نسبتاً زیادہ ہیں۔ یہ تذکرہ اردو زبان کا بالکل انوکھا اور جدید تذکرہ ہے۔ اس کی زبان ایک طرح سے الہامی زبان ہے اس کو پڑھنے سے طبیعت اکتا نہیں جاتی تسلسل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا یا یوں کہیے کہ آزاد کا قلم خیالات کی روانی میں ان کا ساتھ چھوڑنا نہیں چاہتا۔

یہ جدید طرز کا سب سے پہلا تذکرہ اور اپنے وقت کے سارے تذکروں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے قبل شعراء کے کلام پر یا تقریظیں ہوتی تھیں یا اس کی تعریفیں۔ آزاد نے سب سے پہلے تنقید کا راستہ نکالا اور حتی الامکان تحقیق اور تدقیق سے کام لیا۔ بڑی محنت اور کاوش سے حالات جمع کیے۔ روایات اکھٹا کیں۔ اور جزئیات کو محققانہ انداز سے جما کر واقعات زندگی ترتیب دیے، عادات، اطوار، خصایل، چال چلن، علمی تبحر، احول خصوصیات کلام، غرض ہر ایک ضروری بات کا پتہ چلایا اور آنے والوں کے لیے فن تنقید کا دیا روشن کر دیا۔ تنقید نگاروں اور تذکرہ نویسوں نے اس پر بعض قسم کے اعتراضات کیے ہیں لیکن ہر شخص اپنی رائے دینے اور اپنے خیالات ظاہر کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اس لیے میری ذاتی رائے یہ ہے کہ آب حیات کی تنقیدیں اور آب حیات کا تنقیدی پیرایہ

اپنی آپ نظیر ہے۔ اگر اس کے تنقیدی پیرایہ میں کوئی سقم ہے تو اس قدر کہ اس میں تنقیدی زبان کی بجائے افسانوی زبان استعمال کی گئی ہے۔ اب رہی واقعات اور جزئیات کی صحت تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ مولانا آزاد سے جو شعراء کے تذکرے کے پہلے مدون تھے، مورخانہ انداز اور اتنی شدید صحت کی توقع رکھنا خلاف عقل و انصاف بلکہ ایک زیادتی ہے۔

آب حیات کی زبان ہے کہ جادو، سحر ہے کہ افسوں۔ گھنٹوں پڑھتے چلے جائیے اکتانا تو درکنار جی ہی نہیں بھرتا۔ اُردو کے کسی اور ادیب یا انشا پرداز کی زبان اس زبان سے لگا نہیں کھا سکتی۔ نہ مولانا حالی کے ہاں یہ شوخی اور ظرافت ہے نہ سرسید کے ہاں یہ رنگینی و لطافت نہ اکبر کے ہاں یہ علمی وقار و متانت ہے۔ نہ نذیر احمد کے ہاں وہ اختصار و زور ہے۔ اور نہ منشی ذکاءاللہ کے پاس وہ حسن و نزاکت ہے۔ غرض آزاد کا تیکھا پن اور ان کے قلم کا جادو، بس انھیں کا حصہ ہے۔ اس چابک دست مصور ادب نے نثر میں نظم کی روح بھر دی ہے۔

اُردو زبان میں آب حیات کی زبان کو ایک خاص نمایاں اور ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ زبان کا منتر دیکھیے کہ کتاب ہاتھ میں لیتے ہی پڑھنے والا عبارت کی دل فریبیوں میں کچھ ایسا محو ہو جاتا ہے کہ دنیا و

مافیہا کی خبر نہیں رہتی ۔ یہ حالت خود پڑھنے والوں پر بیسیوں مرتبہ گذری ہے ۔ کہ کسی خاص شاعر کے حالات دیکھنے کے لیے پڑھنا شروع کیا تو بس گھنٹوں گزر گئے ۔ کہاں سے کہاں جا پہنچے اور اصلا خبر نہ ہوئی کہ کہاں جانا تھا اور کہاں ٹھہرے ہیں ۔ جب کسی خارجی سبب سے اس کی زبان کا طلسم ٹوٹا تو کہیں پتہ چلا کہ پڑھنا کچھ تھا اور پڑھ گئے کچھ ۔

یوں تو آرٹ کی ہر تقلید ایک نئی دنیا ہے ۔ آزاد نے اپنی شاعرانہ نوک جھونک سے اس نثری گلدستہ کو قسم قسم کے پھولوں سے سجایا ہے ۔ محاکات شاعری کے ہر نوک پلک سے اس دلہن کو آراستہ کیا ہے، جس کے زلف پر پیچ میں شاعری پھولوں کے ہار کی طرح اُلجھ کر رہ گئی ہے ۔ اس سلسلہ میں مجھے اس جملہ کو دھرانا چاہیے جو مولٰنا عبداللہ عمادی صاحب نے ارقام فرمایا ہے ۔

"آب حیات کے مسودے میں نے دیکھے ہیں سادہ زبان میں واقعات لکھے ہیں بعد کو مرصع فرمایا ہے"

حسن نظامی صاحب آبِ حیات کی نسبت کیا گلفشانی کرتے ہیں ۔

"آب حیات شعراء کا تذکرہ بھی ہے اور بزم مشرق کی آخری بہار کا افسانہ بھی"

اس تذکرے کے آٹھ دس ایڈیشن اب تک نکل چکے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے دلکش جملے اور ان کا مترنم توازن، خوبصورت آسان ترکیبیں اور سریع الفہم تشبیہیں مصور الفاظ، نرم و شیرین انداز بیان، نتھری ہوئی دہلی کی زبان، یہی وہ مئی ہفت آتشہ ہے جس کے خمار میں پڑھنے والا اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھتا ہے۔ اور ان کاغذی تحریروں میں اتنا محو ہوجاتا ہے کہ خود کو بھی تھوڑی دیر کے لیے اسی دنیا میں محسوس کرنے لگتا ہے۔

آزاد کی تحریر اپنی آپ نظیر ہے۔ مگر آب حیات اور قصص ہند ان کے شاہکار ہیں۔ شگفتگی، شوخی زور، رنگینی، حسن اور دلکشی۔ ان کی تحریر کی خصوصیات ہیں۔ فارسی اور عربی کے ثقیل الفاظ، پیچیدہ ترکیبیں، دور از کار تشبیہیں، صنائع بدائع کا لایعنی دفتر، بیجا تکلفات و تصنعات سے ان کی نثر پاک ہے۔

آب حیات کی زبان میں ایک خاص موسیقیت ہے۔ جس کی ترنم ریزیاں دل و دماغ کو مست کیے دیتی ہیں۔ غرض آب حیات درحقیقت آب حیات ہے۔ جس کی زبان مردہ دلوں میں اُمنگ اور زندگی پیدا کرتی ہے پھر لطف یہ ہے کہ کہیں اِبتذال نہیں۔ سوقیانہ رنگ نہیں۔

دوست تو دوست دشمن بھی آب حیات کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ اس کی

زبان کی سحر طرازیوں نے ایک عالمگیر شہرت اختیار کرلی ہے۔ اور یہی زبان ہے جس کی بدولت آزاد آج تک مقبول خاص و عام ہیں۔ اپنی طرز کے آپ موجد ہیں۔ انگریزی زبان کے ماہران فن بھی اس معیار کمال پر مشکل سے پورے اتر سکیں گے۔ ڈیکوئنسی، لیمب، وغیرہ معدودے چند نثار ہی آزاد کی جادو نگاری کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ آزاد کی وفات پر ندوہ کے ماتمی جلسہ میں شبلی مرحوم آب حیات کو بغل میں دبائے آئے اور فرمایا۔

"آج جس شخص کا ماتمی جلسہ ہے اس کی اس تصنیف کو میں نے ۱۸ مرتبہ پڑھا۔"

آب حیات کی شب اور شبستان کے خیالات اپنے اندر ایک گنج گراں مایہ رکھتے ہیں۔ الفاظ کی پھبن اپنی دلکشی کا جواب نہیں رکھتی۔ مثلاً

"فلک تیر حوادث کا ترکش اور کمان کہکشاں لگائے کھڑا ہے۔ اگر عاشق کا تیر آہ اس کے سینہ کے پار جاتا ہے پھر بھی زحل منحوس کی آنکھ نہیں پھوٹتی کہ عاشق کی صبح مراد ہو۔ باوفا شمع عشق کے تپ میں سراپا جلتی ہے۔ اس کی چربی گھل گھل کر بہتی ہے۔ مگر پائے استقامت اس کا نہیں ٹلتا۔ یہاں تک کہ سفیدۂ سحری کبھی آکر کافور دیتی ہے اور کبھی نباشیر۔ شمع کا

دل اس کے لیے بھی گداز ہے کہ شب زندگی کا دامن بہت چھوٹا
ہے۔ لیکن صبح دونوں کے ماتم میں گریباں چاک کرتی ہے یجۂ
آفتاب فلک کے سبز گھوڑے پر سوار کرن کا تاج زرنگار سر پر
رکھے شفق کا پھریرا اُڑاتا ہوا اپنے حریف شاہ انجم کی فوج کو
پریشان کرکے فتح یاب آیا ہے۔"

یہ تو ایک رات اور دن کا سماں تھا۔ اب ان کی بھاشا کے باغ کی
بہار دیکھیے۔ فارسی کے ادیب کے مقابلہ میں بھاشا کے انشا پرداز کا سلیقہ
بتاتے ہیں کہ وہ برسات میں اپنا باغ کیسے سجاتا ہے۔

"درختوں کے جھنڈ چھائے ہیں۔ گھن کے پتے ہیں۔ ان
کی گہری گہری چھاؤں ہے۔ جامن کی ٹہنیاں آم کے پتوں میں
کھچڑی ہو رہی ہیں۔ کھرنی کی ٹہنیاں فالسے کے درخت میں پھیلی
ہوئی ہیں۔ چاندنی کی بیل کمرک کے درخت پر لپٹی جاتی ہے۔
عشق پیچ کی ٹہنیاں گلروندے پر ایسی چھائی ہیں جیسے سانپ
لہرا رہے ہیں کسی ٹہنی پر بھونرے کی آواز۔ کسی میں مکھیوں کی
بھنبھناہٹ الگ ہی سما باندھ رہی ہے۔"

اس کیف و سرور سے اس قصہ کو ختم کرتے ہوئے برکھا رت کی بہار

دکھاتے ہیں ۔ پھر شام کا سماں اور رات کی اُداسی میں شرارے بھاتے ہیں مثلاً :۔

"آدھی رات اِدھر آدھی رات اُدھر، جنگل سنسان، اندھیر بیابان، مرگھٹ میں دُور دُور تک راکھ کے ڈھیر، جلے ہوئے لکڑ پڑے، کہیں کہیں چِتا میں آگ چمکتی ہے، پھر وہ سنسان میدان، پتے ہوا سے کھڑکتے ہیں، ہوا کا سناٹا، پانی کا شور، الو کی ہوک، وحشت کو دوبالا کرتے ہیں۔"

جب نظم اُردو کی تاریخ لکھتے ہیں تو اپنی انشا پردازی کا وہ کمال دکھاتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے ۔ جتنی مرتبہ پڑھو طبیعت چاہتی ہے اتنی ہی مرتبہ پھر پڑھو۔ ہر وقت ایک نیا لطف آتا ہے ۔ اس میں شاعر کی فطرت کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :۔ اس کے خیالات سچ کے پابند نہیں ہوتے ۔ وہ اپنے مطلب کے موقع پر ہر بات موزوں کر لیتا ہے ۔ اس کے واقعات اصلیت کے ذمہ دار نہیں ہیں ۔ گویا شاعری میں سچ بولنا اپنے وجدان کو متاثر کرنا ہے ۔ مثلاً

"شاعر جب صبح کا نور ظہور دیکھتا ہے تو کبھی کہتا ہے دیگ مشرق سے دودھ ابلنے لگا۔ کبھی کہتا ہے دریائے سیماب موج

مارنے لگا۔ کوئی مشرق سے کافور اُڑاتا ہے، کبھی مرغان سحر کا
غل اور عالم نور کا جلوہ، شام کو شفق کی بہار دکھاتا ہے۔
مغرب کے چھپر کھٹ میں آفتاب نے آرام کیا اور شنگرفی چادر
تان کر سو رہا، کبھی کہتا ہے جام فلک خون سے چھلک رہا ہے،
نہیں مغرب کے ایوان میں آگ لگ گئی، تاروں بھری رات
میں چاند کو دیکھ کر کہتا ہے دریائے نیل میں نور کا جہاز چلا جاتا ہے"
صفحہ ۸۵ تک تاریخ زبان اردو، ہندی اور فارسی انشا پردازی
تاریخ نظم اردو پر خوب عالمانہ و شاعرانہ بحث ہے۔

پہلے دور میں ولی اور ان کے قریب العصر باکمال جلسہ جمائے بیٹھے
ہیں۔ دوسرے میں شاہ حاتم، خاں آرزو، فغاں ہیں۔ تیسرے کی محفل
کے سرگرم کار مرزا مظہر جان جاناں، میر سوز اور درد ہیں۔ میر تقی میر نے
لاکھوں درد دل جمع کر کے غم والم کی دیوار اٹھائی ہے۔ سودا کے قصیدوں کی
اظہار شخصیت کا وہ عالم کہ پناہ بخدا۔ ان کے کلام کو جمع کر کے ایک دیوار
قہقہہ بلند کی ہے۔

چوتھا دور مصحفی، انشا اور جرأت کے ہنگاموں سے معمور ہے۔
پانچویں دور میں ناسخ، آتش، شاہ نصیر، مومن، ذوق، غالب، انیس و

دبیر کے دھواں دھار کلام اور محشر سامانیوں کی ہل چل ہے۔

آتش کو رجائی شاعری کا بادشاہ بنایا ہے جس کے دھول دھپوں سے حقیقت کی رگیں دکھ رہی ہیں۔ ناسخ کے یہاں بڑا بول ہے۔ دھوم دھام ہے۔ ہا و ہو کی گرمی بازار ہے۔

غرض آب حیات ایک گیتائے شعراء ہے۔ جس میں دنیائے شاعری کے درخشندہ ستارے آزاد کے قلم سے جینے لگے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جس کا ذکر انھوں نے کر دیا ہے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ جاوید ہو گیا اور جس کا ذکر نہیں کیا ہے وہ حقیقت میں ان کے آب حیات سے محروم ہو گیا۔ آزاد نے یہ ایک ایسا ابدی نغمہ اپنے پیچھے چھوڑا ہے کہ دنیائے ادب ان کے اس ادبی احسان کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی یہ ان کے بلند پایہ ادبیت کا ایک کھلا ثبوت ہے۔

نیرنگ خیال آب حیات کے بعد آزاد کی اہم تصنیف جو شاعرانہ خیال آرائیوں اور ادبی گل کاریوں کی وجہ سے ان کا دوسرا بڑا کارنامہ ہے وہ "نیرنگ خیال" ہے۔

یہ دو حصوں میں ۱۸۸۰ء میں تصنیف ہوئی۔ حصہ اول ۱۲۰ صفحہ کی کتاب ہے۔ اس میں دیباچہ ملا کر کل ۱۴ مضمون ہیں۔

دنیا کی دوسری زبانوں میں لٹریچر کی ایک صنف مائیتھالوجی ہے جس میں انسانی جذبات اور مذہبی معتقدات مشخص طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ فی زمانا انسان کا تخیل اشکال وصور کو بہت جلد گرفت کر لیتا ہے۔ مثلاً غصہ، رحم اور انصاف کو ان کے خصایص طبعی کی بناء پر ویسی ہی انسانی شکلوں میں ڈھالا جائے تو پڑھنے والا اس سے بہت جلد متاثر ہوتا جاتا ہے۔ انگریزوں میں اس طرز بیان کی ایک مشہور کتاب پل گرمس پروگرس (زایر کا سفر) کے نام سے موسوم ہے۔ جس میں مسیحی عقاید اور محاسن اخلاق کو محسوس صورتوں میں پیش کیا گیا ہے۔

"کہا جاتا ہے[1] کہ انجیل کے بعد جس کتاب نے مسیحیت کے قبول کرنے کی سب سے زیادہ ترغیب لوگوں کے دلوں میں پیدا کی وہ وہ یہی سفرنامہ ہے۔ اس کتاب کے مقبول عام ہونے کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کا ترجمہ اب تک دنیا کی تقریباً ۸۴ زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اس طرز بیان کو پیش نظر رکھ کر آزاد نے بھی "نیرنگ خیال" لکھی ہے۔ چنانچہ خود آزاد لکھتے ہیں "یہ چند مضمون جو لکھے ہیں۔ نہیں کہہ سکتا کہ ترجمہ کیے ہیں۔ ہاں

[1] مولانا سعید انصاری بی۔ اے۔

جو کچھ کانوں سے سنا اور فکر مناسب نے زبان کے حوالے کیا۔ ہاتھوں
نے اسے لکھ دیا۔"

بالعموم یونانی اور رومی لوگوں کو اس قسم کی کتابوں کا بڑا شوق تھا۔
انگریزی میں اڈیسن جان بنین اور اسپنسر کے ایلیگری (خیالی قصے) مشہور ہیں
فارسی میں مولانا روم اور انوار سہیلی سنسکرت میں ہتوا پدیش اور عربی میں اخوان الصفا
وغیرہ۔ آزاد نے غالباً اپنے قصوں کی بنیاد یونانی قصوں پر رکھی ہے۔ اور
اس سے ان کی یونانی علم الاصنام کی واقفیت کا بہت کچھ پتہ چلتا ہے۔ اس
کتاب میں انسان کے مختلف اوصاف و خصائل اس کے جذبات و خواہشات
مشخص طور پر دکھائے گئے ہیں۔

مؤلف تاریخ ادب اردو لکھتے ہیں :۔

"ڈاکٹر لائیٹنر نے ان کو اس کتاب کے لکھنے کی ترغیب
دی تھی۔ اور اس کا خاکہ تیار کر دیا تھا۔ مگر یہ بڑی قابل تعریف
بات ہے کہ مولانا آزاد باوجود انگریزی کم جاننے کے اس اتباع میں
کامیاب ہوئے۔ یہ کتاب ان کے خاص طرز تحریر میں لکھی گئی ہے۔
مگر نفس مضمون سے زیادہ طرز بیان بہت دلچسپ ہے۔"

مولانا حالی اس کی نسبت رقم طراز ہیں۔

"آزاد کے قلم نے پہلے پہل جذبات انسانی کی تجسیم و تشخیص کی اور معقولات کی تصویریں محسوسات کی شکلوں میں کھینچی ہیں۔ اور خصایل انسانی کے فطری خواص ایسے مؤثر اور دلکش پیرایہ میں بیان کیے ہیں۔ جن سے اردو لٹریچر اب تک خالی تھا۔"

مؤلف سیر المصنفین اپنے تذکرہ میں ارقام فرماتے ہیں۔

"نیرنگ خیال کی نثر ہزار نظموں پر فوقیت رکھتی ہے۔ رنگین بیانی کا ایک دل فریب مرقع ہے۔ اخلاقی اور تمدنی اصلاح کا ایک پختہ کار دستور العمل، پند و نصائح کا ایک دفتر ہے استعارے و تمثیل میں وہ وہ مطلب کی باتیں بتائے گئے ہیں کہ پڑھنے والا شستہ خیالات سے مالا مال ہو جاتا ہے۔ اس کتاب نے اردو نثر کی نئی طرز قائم کی۔ اگرچہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کتاب میں زیادہ تر انگریزی روش کا پرتو ہے جس میں مضمون نویس کی جدید طرز کا چربہ اتارا ہے۔"

اس میں مختلف مضامین ہیں۔ جن میں سے بعض کے یہ عنوان ہیں۔ سیر زندگی، انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا۔ شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار، گلشن امید کی بہار وغیرہ اور سب سے آخر ایک نظم ہے موسومہ "شام کی آمد

اور رات کی کیفیت ـ"

سیر زندگی میں سارا فلسفہ بھر دیا ہے ۔ زندگی کی سیر اس آن بان سے شروع کی ہے ۔

" ایک حکیم کا قول ہے کہ زندگی ایک میلہ ہے اور اس عالم میں جو رنگارنگ کی حالتیں ہم پر گذرتی ہیں یہی اس کے تماشے ہیں ۔ لڑکپن کے عالم کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھے تو جوان ہوئے اور پھر پختہ سال انسان ہوئے ۔ اس سے بڑھ کر بڑھاپا دیکھا ۔ اور حق پوچھو تو تمام عمر انسانی کا عطر وہی ہے ۔"

پھر اس عمر انسانی کے عطر پر ایک نوٹ لکھا ہے جس کی تشریح میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے ۔ ان کی سیر زندگی کتاب کے ۹ صفحوں پر چھائی ہوئی ہے ۔ جو صرف پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے ۔

اسی طرح "انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا" ایک قیامت کا مضمون ہے ۔ اس میں اس فلسفہ کو نبھایا ہے کہ " اگر ہم اپنی اپنی مصیبتوں کو آپس میں بدل بھی سکتے تو پھر ہر شخص اپنی پہلی ہی مصیبت کو اچھا سمجھتا" اور یہ امر واقعہ ہے ۔

ایک موقعہ پر آزاد کو سوچتے سوچتے اور فلسفہ کے کسی پہلو پر غور کرتے کرتے

نیند کا غلبہ ہو جاتا ہے وہ سو جاتے ہیں اور جو خواب کہ وہ دیکھتے ہیں اس کو مضمون کی شکل میں قلم بند کرتے ہیں۔

شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار ایک دوسرا ہی رنگ لیے ہوئے ہے۔ فرماتے ہیں۔

"بقائے دوام دو طرح کی ہے کہ ایک تو وہی جس طرح روح فی الحقیقت بعد مرنے کے رہ جائے گی اس کے لیے فنا نہیں۔ دوسرے وہ عالم یادگار کی بقا جس کی بدولت لوگ نام کی عمر سے جیتے ہیں اور شہرت دوام کی عمر پاتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ اچھے سے اچھے اور بڑے سے بڑے کام جن جن سے ہوئے یا تو ثواب آخرت کے لیے۔ یا دنیا کی ناموری اور شہرت کے لیے ہوئے"

پھر اس مضمون کو تشبیہوں اور استعاروں سے خوب مرصع کیا ہے۔ مثلاً شاہان مغلیہ کا ذکر ہے۔ ان کو ایک مخصوص پیرایہ میں لکھا ہے۔ سعدی اور ابوالفضل کا ذکر۔ ہندوستانی باکمال شعراء کا بھی کچھ تذکرہ ہے جو اس مضمون کا نچوڑ ہے۔ جیسے

"دیکھتا کیا ہوں ایک غول ہندوستانی شعراء کا آرہا ہے۔ ان میں ایک شخص جو بات کرتا ہے منہ سے پھول جھڑتے

ہیں۔ لوگ ساتھ ساتھ دامن پھیلائے تھے۔ مگر بعض پھولوں میں کانٹے ایسے ہوتے تھے کہ لوگوں کے کپڑے پھٹے جاتے تھے۔ پھر بھی مشتاق زمین پر گرنے نہ دیتے تھے۔ کوئی نہ کوئی اٹھا لیتا تھا۔ وہ مرزا رفیع سودا تھے۔

میر بدوماغی اور بے پروائی سے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتے تھے شعر پڑھتے تھے اور منہ پھیر لیتے تھے۔ درد کی آواز دردناک دنیا کی بے بقائی سے جی بیزار کیے دیتی تھی۔ میر حسن اپنی سحر بیانی سے پرستان کی تصویر کھینچتے تھے۔ انشا قدم قدم پر نیا بہروپ دکھاتے تھے۔ جرات کو اگرچہ کوئی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ مگر جب وہ میٹھی آواز سے ایک تان اڑاتا تھا تو سب کے سر ہل جاتے تھے۔

ناسخ کی گل کاری چشم آشنا معلوم ہوتی تھی مگر آتش کی آتش بیانی اسے جلائے بغیر نہ چھوڑتی تھی۔ مومن کم سخن تھے۔ مگر جب کچھ کہتے تھے جرات کی طرف دیکھتے جاتے تھے۔ ذوق کے آنے پر پسند عام کے عطر سے دربار مہک گیا۔ انھوں نے اندر آ کر شاگردانہ طور پر سب کو سلام کیا۔ سودا نے اٹھ کر

ملک الشعراء کا تاج ان کے سر پر رکھ دیا۔ غالب اگرچہ سب سے

پیچھے تھے پر کسی سے نیچے نہ تھے۔ بڑی دھوم دھام سے آئے اور

ایک نقارہ اس زور سے بجایا کہ سب کے کان گنگ کر دیے۔ کوئی

سمجھا اور کوئی نہ سمجھا مگر سب واہ واہ اور سبحان اللہ کرتے رہ گئے۔"

یہ سب عالم رویا کا فسانہ ہے۔ اس انداز بیان میں اتنی رنگینی اور جدت

ہے کہ آج اکثر اہل قلم آزاد کے اس رنگ کو اڑانے کی سعی کر کر رہ جاتے ہیں مگر

تحصیل حاصل۔ کیونکہ آزاد کا رنگ آزاد ہی کا حصّہ ہے۔ "علوم کی بدنصیبی"

بھی ایک معلومات کا دفتر۔ صنائع لفظی کا گلدستہ ہے۔ یہ نثری شہ کار صرف

پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

یوں تو نیرنگ خیال کی عبارت دیکھنے میں ایک خیالی تصویر معلوم

ہوتی ہے۔ مگر دور اندیشی کی آنکھ سے دیکھنے والا سمجھ سکتا ہے کہ زمانہ اور

اہل زمانہ کو جس قسم کے لٹریچر کی ضرورت ہے اس کی جا بجا اس میں جھلک

نظر آتی ہے۔ تمثیلاً مغربی زبان کے مضمون کو زبان اردو میں ڈھال کر شعرا

اور اہل قلم کو ہدایتیں ہیں کہ مشرقی زبان اردو کے مالک بن کر مغربی

خزانوں پر بھی متصرف ہوں۔ اس طرح ان دونوں زبانوں کے تجربے

سے ایک ایسا سمویا ہوا دریا بہائیں جس سے ملک سیراب ہو جائے اور

زبان کا خزانہ مالا مال ہو جائے۔ ان تمام مطالب کو آزاد نے نظم کے بدلے نثر کا لباس پہنا کر اس طرح پیش کیا ہے کہ نیرنگ خیال کا تخیل اور اس کی نثر نظم کی سرحد کو ٹکراتی ہوئی آگے نکل گئی ہے۔ آخر میں کیفی صاحب کی اس وقیع و گراں قدر رائے پر اس کا ذکر ختم کر دیا جاتا ہے۔ آپ منشورات میں لکھتے ہیں۔

"نثر کی وقیع تصنیف جو بلا تخصیص اپنی ہو سکتی ہے آزاد کا نیرنگ خیال ہے۔ یہ کتاب فی الواقع اسم با مسمیٰ ہے۔ یہ نثر ہزار نظم کی کتابوں پر فوقیت رکھتی ہے رنگین بیانی کا ایک دل فریب مرقع ہے۔ اخلاقی اور تمدنی اصلاح کا ایک پختہ کار دستور العمل، پند و نصائح کا ایک بہتا ہوا سیلاب ہے۔"

اس کا ہر مضمون اپنی نیرنگی میں ع ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است کا مصداق ہے چنانچہ الگ الگ ایک ایک مضمون کا تجزیہ کرنا دریا کو کوزہ میں بند کرنے سے کچھ کم نہیں۔

(۱) "سیر زندگی" کا مضمون ڈاکٹر جانسن کے واچ آف لائف کا خلاصہ ہے۔

(۲) "شہرت عام و بقائے دوام" میں گولڈ سمتھ کے فہم کو بچ سے خیالات لیے ہیں۔ اس طرح اردو ادب میں پرایا ادب ضم کر کے اپنے ادب کو مالا مال کر دیا ہے۔

نیرنگ خیال حصۂ دوم | یہ ۱۱۲ صفحہ کی ایک تصنیف ہے۔ ان کی خیالی انشاپردازی اور صنائع لفظی کا ایک بیش بہا مرقع ہے۔ دیباچہ آغا محمد طاہر نے لکھا ہے۔ شاید دوبارہ چھپی ہے۔ دیباچہ میں ۲۳ ر جنوری ۱۹۲۳ء اس کی تاریخ ہے۔ تمہید سے آزاد کا رنگ شروع ہوا ہے۔ اس کی کل کائنات چھ مضامین ہیں :—

جنت الحمقا، خوش طبعی، نکتہ چینی۔ مرقع خوش بیانی، سیر عدم، بقائے دوام۔ سب مضامین میں انسانی خصایل کو مشخص کیا گیا ہے۔

جنت الحمقا میں وہی خواب کی باتیں ہیں مثلاً یہ کہ

"سوتے سوتے ایسا معلوم ہوا گویا کسی نے مجھے ایک پہاڑ پر پھینک دیا ہے۔ مگر عجیب پہاڑ ہے کہ جس کے چاروں طرف سبزہ لہلہاتا ہے"

ان سبزہ زاروں میں سے بھٹکتے ہوئے پہاڑ کی چوٹی پہ پہنچتے ہیں وہاں سے دیکھتے ہیں کہ دور ایک چشمہ ہے اس میں ایک شہزادی پاؤں لٹکائے بیٹھی ہے کہ زیور اور لباس سے طاؤس مرصع کا عالم ہے۔ مگر آنکھ سے بھینگی ہے۔ اور یہ ملکہ غلط فہمی ہے۔ اسی کے برابر ایک دوسری عجوبۂ روزگار شکل نظر آئی جس کے بے انتہا سر ہیں اور دھڑ ایک، جس بات کی پسند ناپسند پر سر ہلاتی ہے

تمام جہان کے سر اسی طرح ہل جاتے ہیں۔ اس کا نام پسند عام ہے۔ یہ دونوں ساتھ رہتی ہیں ؟ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتنی گہری باتیں ہیں۔ پھر خوشامد، خام خیالی، پدرم سلطان بود کا گھمنڈ، ناانصافی، رسوائی، خود پرستی پر خامہ آرائی کی ہے۔ زندگی کو ایک اندھیری کوٹھری سے تشبیہ دی ہے مراد اس قید سے قید حیات ہے۔ جس کا نقشہ اور جس کی مثال یوں دی ہے۔

"جن مکانوں میں یہ لوگ ڈال دیے گئے ہیں۔ ان کی خرابی دیکھنی چاہو تو دل ہائے پریشان کی بدحالی دیکھو"

چنانچہ انہیں رنگینوں کا سرمایہ لیے ہوئے یہ مضمون صفحہ ۳۱ پر ختم ہوجاتا ہے۔ اور "خوش طبعی" پر خوش الحانیاں شروع کر دی ہیں "خوش طبعی کی تعریف میں یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ وہ کیا شئے ہے۔

البتہ یہ کہنا آسان ہے کہ وہ کیا شئے نہیں ہے۔ اور اس کا نسب نامہ لکھ دیا ہے مثلاً سچ، خوش طبعی، حسن بیان، حسن ادب، خندہ جبینی اس کے خاندانی ممبر ہیں۔ اب اس کو ایک قصّہ کے پیرایہ میں سلجھایا ہے۔ اور بات میں بات پیدا کی ہے۔ یہ خاندانی بحث صفحہ ۳۷ پر ختم کر دی ہے۔

"نکتہ چین" کے عنوان سے دوسرا مضمون شروع کیا ہے اور لکھا ہے کہ کسی نکتہ چین ناانصاف کی بدولت تصنیف کا کیا حال ہوتا ہے۔ ایک مصنف پر

لوگ کیسے کیسے آوازے کستے ہیں۔ اور یہ غریب نہ ان سے کسی شئے کا طالب ہے نہ ان کے کسی کام میں حارج ہے۔ بات اتنی ہے کہ اپنی یا اپنے کلام کی شہرت چاہتا ہے۔ اس کے لیے کتنی مصیبتیں اٹھاتا ہے۔ اپنے آرام کا خون کرتا ہے چراغوں کے دھویں کھاتا ہے۔ نیند حرام کرلیتا ہے۔ دماغ کا عرق پیشانی سے ٹپکاتا ہے۔ اکثر نتیجہ ناکامی ہی ہوتا ہے۔ فائدہ کچھ بھی نہیں۔ قدر کسی کو نہیں۔ مگر یہ اپنے شوق کو پورا کرتا ہے۔ اور اپنے علم کو عمل سے دو چار کر کے ایک طرح قوم کی خدمت کرتا ہے۔ مگر وہی قوم اس کا مذاق اڑاتی ہے۔ اصل مفہوم تو خبط ہو جاتا ہے۔ کہتے کیا ہیں کہ بس نام کی خاطر یہ کام کیا۔ اس کی تصنیف میں وہ وہ کیڑے ڈالتے ہیں کہ پھر اس غریب کی ہمت نہیں ہوتی کہ کچھ لکھے اس پر کیا اچھی تشبیہ دی ہے۔

"کالا ناگ راگ سے پرچ جاتا ہے۔ اور بھونکتا کتا بھی ہڈی سے چپ ہو جاتا ہے۔ آج کل کے نکتہ چین اگرچہ سانپ جتنے دانت بھی نہیں رکھتے مگر اس سے بھی سوا زہر اگلتے ہیں۔ اور کتے کے برابر بھی نہیں کاٹ سکتے۔ مگر بھونکنے میں اس سے بھی کئی میدان پرے نکل جاتے ہیں۔"

اس تمہید کے بعد نکتہ چینی کو مشخص کرتے ہوئے اس کو خواجہ حق پرست

اور محنت خاتون کی بیٹی بنایا ہے۔ جس کو پیدا ہوتے ہی انصاف کے سپرد کردیا گیا۔ علم و دانش کے محلوں میں پروان چڑھی۔ اس کے بائیں ہاتھ میں ایک مشعل بھی تھی کہ اس کی روشنی کبھی نہ بجھتی تھی اس مشعل کو خود محنت خاتون نے بنایا تھا۔ اور حق پرست نے روشن کیا تھا۔ بڑا جوہر اس میں یہ تھا کہ چیز کیسی ہی مخفی ہو۔ اس کی روشنی سارے کا سارا حال جوں کا توں آئینہ کردیتی تھی۔ ظاہر آرائی اور غلط نمائی کے بیچوں میں اس کی شعاع سوئی کی طرح بیٹھ جاتی تھی۔ غرض وہ نکتہ چینی جو اصلاح کے لیے کی جاتی ہے اس پر ان استعاروں میں اس مضمون کو ختم کیا ہے۔ ۱۵ صفحہ پر یہ قصّہ ختم ہوگیا۔

اور دوسرے صفحہ سے "مرقع خوش بیانی" کا دفتر کھل گیا۔ اس میں بھی وہی خواب ہے۔ عالم رویا کی سرزمین ہے۔ دشت وجبل کا منظر ہے شہر ہے باغ ہے کھیت ہیں جنگل ہے۔ مگر کسی چیز میں اصلیت کا رنگ نہیں۔ یہ سارا طلسم دروغ کی کائنات کا عکس ہے۔ ان مصنوعی چیزوں پر جب سچائی اپنا پرتو ڈالتی ہے تو ساری قلعی کھل جاتی ہے۔ سچ کی روشنی میں یہ چمکتی ہوئی چیزیں ایسی غائب ہوجاتی ہیں جس طرح سورج نکلتے ہی تاروں کی جھل ملاہٹ مدہم پڑی جاتی ہے اور پھر اس کی روشن کرنیں ان کی بساط پر پورا پورا قبضہ کرلیتی ہیں۔ دروغ کے بھوت ان پریوں کے سایہ میں مانند

پڑکر بالکل غائب ہو جاتے ہیں۔ پس یہ قصہ ۶۵ صفحہ پر ختم اور اب "سیرِ عدم" کو نکلتے ہیں پسماندوں کو چھوڑ کر عدم کی سیر ایک عبرت و الم کی داستان ہے۔ اس میں ان بدنصیبوں کا کچا چٹھا ہے جو مرنے والوں کے پیچھے رونے کو رہ جاتے ہیں۔ جان صحرائے تصور میں ان کے پیچھے کیسی بھٹکتی پھرتی ہے۔ مگر جب تھک جاتی ہے تو مایوس اور اداس منہ لپیٹے پڑی رہتی ہے۔ لکھتے ہیں۔

"عقل و فہم دلِ غمگین کو سہارا دے سکتے ہیں مگر دل ایسا بھولا بھالا شخص ہے کہ ذرا نہیں سمجھتا۔ اور جو غذا اس جی کو بھاتی ہے اس کو ڈھونڈتا ہے۔ درحقیقت یاد جو دل کی ہمسائی ہے وہ ہمیشہ غم کو خانۂ دل میں بلاتی ہے"

غرض ایسی ایسی باتیں یاد آتی ہیں جن سے دل پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے مگر امتداد زمانہ بتدریج ان صدمات کو کم کر دیتا ہے۔ وقت اپنے ساتھ عقل و فہم کی فوج لاتا ہے اور حسرت و اشتیاق کے جذبات کو اپنی ممکنہ حد تک دبانے کی کوشش کرتا ہے۔ یا پھر کوئی دوسرا ہی شوق غالب آجاتا ہے۔ اور ان کی شدت میں کمی آجاتی ہے۔ یہاں تک لکھنے کے بعد پھر آزاد پر نیند کا دیوتا اپنے افسوں کے زور سے نازل ہو جاتا ہے۔ اب پھر وہی قصہ کا رنگ ہے۔ خواب کی دنیا ہے۔ نیرنگ خیال کیا ہے

آزاد کے خیالی جلسے ہیں جن میں تخیل ہی تخیل کی حکومت ہے۔ خیالات کا بہاؤ انھیں کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے اور قصہ کے اندر قصہ پیدا ہوتا ہے۔

اس طرح یہ داستان ۷۷ صفحہ پر ختم ہوگئی ہے۔ اور بقائے دوام کا قلم طاہر صاحب کے ہاتھ آیا ہے۔ ۱۱۲ صفحات تک انھوں نے فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیے ہیں۔ ان کے اس مضمون میں آزاد کے شہرت عام و بقائے دوام کی جھلک ہے۔ انھوں نے اسی نہج پر اس کو لکھنے کی کوشش کی ہے۔

پس نیرنگ خیال کی خیالی دنیا بقائے دوام پر ختم ہوگئی ہے۔ مگر یہ دنیا محض خیالی نہیں اس میں بڑے بڑے زندگی کے راز "خیال" کا بھیس بدلے بیٹھے ہیں۔ جن کو سمجھنے کے لیے اتنا ہی مبلغ عقل و علم درکار ہے۔

دربار اکبری آزاد مرحوم کی تاریخی تصانیف میں دربار اکبری سب سے مشہور کتاب ہے۔ یہ کچھ اوپر ۸۰۰ صفحہ کی ضخیم تصنیف مختلف عنوانات پر مشتمل ہے۔ اپنی عبارت کی رنگینی و دلاویزی کے اعتبار سے بھی یہ ان کی نیسری بہترین تصنیف ہے۔ تاریخ جیسے خشک و بے کیف مضمون میں بھی آزاد کا رنگ نمایاں ہے۔

اس میں جلال الدین اکبر شہنشاہ ہندوستان اور اس کے امرائے

جلیل القدر کے دلچسپ حالات درج ہیں۔ اکبر اور اس کی زندگی کا ہر چھوٹا بڑا کارنامہ۔ اس کی مہمات، تفریحی مشاغل، مصالح مملکت، اس کے عہد کی تصانیف، عمارات، غرض اکبر کے متعلق ہر چھوٹی موٹی بات شاعرانہ جادو نگاری سے آراستہ کرکے قلم بند کی ہے۔ اصل میں یہ کتاب اس عہد کے ہندوستان کی ایک ایسی دلکش اور جامع تاریخ ہے کہ جس میں عام فہم محاورات کے دریا بہادیے ہیں۔ جو مورخانہ شان کے ساتھ اُردو ادب کا بہترین ادبی کارنامہ کہلایا جاسکتا ہے۔ اُردو زبان میں اکبری عہد حکومت کے واقعات اس قدر تفصیل کے ساتھ ایک جگہ ملنے مشکل ہیں۔ جہاں تک وقائع نگاری کا تعلق ہے یہ ان تمام واقعات کا احاطہ کیے ہوئے ہے جن کا تعلق اکبر اور ہندوستان سے ہے۔ اگر کوئی صحیح معنوں میں تاریخ ہند کی اس جلیل القدر ہستی کی زندگی کے حالات من وعن جاننا چاہتا ہے تو وہ صرف دربار اکبری پڑھ لے۔ اور پھر آزاد کا انداز بیان، جس صفحہ کو کھولیے۔

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا این جاست

اگرچہ یہ کتاب وہ خود ترتیب و نظر ثانی کے بعد نہ چھپوا سکے۔ اس کی نسبت اپنے قلمی خط میں لکھا ہے:۔

"دربار اکبری ۷۔۸ سو صفحہ کی کتاب میں نے لکھی ہے۔

اس میں امرائے عہد اکبر کے حالات اسی لطف کے ساتھ بیان ہوئے ہیں جس طرح میر، سودا سید انشا کے حالات آپ نے آب حیات میں دیکھے۔ کتاب تیار ہے۔ فقط نظر ثانی کی کسر ہے مورخہ ۵ جون ۱۸۸۷ء"

مؤلف خمخانۂ جاوید رقم طراز ہیں۔

"ان کی ایک پرانی تالیف موسوم بہ دربار اکبری جسے خود ترتیب دے کے نہ چھپوا سکے حال میں شائع ہوئی ہے۔ مگر اس صورت میں بھی یہ کتاب عبارت کی رنگینی کے اعتبار سے ان کی بہترین تصنیفات میں ہے"

مؤلف تاریخ ادب اردو لکھتے ہیں۔

"یہ مہتم بالشان تصنیف اکبر کے عہد اور ان کے ارکانِ سلطنت کے حال میں ہے اس کتاب کی عبارت اپنے رنگ میں لاجواب ہے۔ افسوس ہے کہ اس پر نظر ثانی نہ ہو سکی۔ اس کتاب میں عہد اکبر کی جیتی جاگتی تصویریں دکھائی گئی ہیں"

لہ۔ طبع اول ۱۸۹۸ء۔

طالب الہ آبادی نے یہ تحقیق کی ہے۔

"یہ کتاب ۱۸۹۸ء میں مطبع رفاہ عام کے مالک و ناظم منشی سید ممتاز علی نے چھپوائی ہے۔ اس وقت اس کی ضخامت صرف ۱۲۸ صفحات کی تھی۔ دوسری مرتبہ محمد ابراہیم صاحب (فرزند آزاد مرحوم) نے ۱۹۱۰ء میں اصل مسودہ کی مدد سے شایع کی۔ جس کا حجم اک بارگی ۱۲۸ سے ۸۴۰ صفحات کا ہوگیا۔"

مؤلف سیر المصنفین لکھتے ہیں۔

"دربار اکبری کی عبارت دیکھ کر انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب کو ضرور لارڈ مکالے کی تاریخ نویسی یاد آجاتی ہے۔ جو لطف انگریزی میں لارڈ موصوف کی تحریر سے پیدا ہوتا ہے بعینہٖ آزاد کی تحریر اردو میں دل پر وہی اثر کرتی ہے اور جس طرح مکالے کی تاریخ انگلستان ناقابلِ اعتماد ہے بعینہٖ یہی حال ایک حد تک دربار اکبری کا ہے۔ کیونکہ آزاد نے اپنی آراء اور اپنے جذبات کو ہر جگہ نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ امر اصول فنِ تاریخ نویسی کے بالکل خلاف ہے۔ اگرچہ اکثر مؤرخ اسی دام میں پھنس جاتے ہیں۔"

اب اپنی تصنیف کی نسبت خود مصنف کا خیال دیکھیے :۔

"لوگ کہیں گے کہ آزاد نے دربار اکبری لکھنے کا وعدہ کیا اور شاہنامہ لکھنے لگا۔ لو اب ایسی باتیں لکھتا ہوں کہ جس سے شہنشاہ موصوف کے مذہب، اخلاق، عادات، سلطنت کے دستور و آداب اور اس کے عہد کے رسم و رواج اور کاروبار کے آئین آئینہ ہوں۔"

اس میں شک وشبہ کی گنجایش نہیں کہ دربار اکبری میں اکبر کے خصایل وعادات بیان کرنے میں آزاد نے اپنے پورے زورِ قلم اور طاقت بیان سے کام لیا ہے۔ جس کی نظیر ان کی تمام تصانیف میں دوسری جگہ مشکل سے مل سکتی ہے۔ لکھتے ہیں :۔

"اس کی طبیعت کا رنگ ہر عہد میں بدلتا رہا۔ بچپن کی عمر کہ پڑھنے کا وقت تھا۔ کبوتروں میں اُڑایا۔ ذرا ہوش آیا تو کتے دوڑانے لگے۔ اور بڑے ہوئے گھوڑے بھگانے اور باز اُڑانے لگے۔ نوجوانی تاج شاہانہ لے کر آئی۔ بیرم خاں وزیر صاحب تدبیر مل گیا تھا۔ یہ سیر وشکار اور شراب وکباب کے مزے لینے لگے۔ لیکن ہر حال میں مذہبی اعتقاد سے دل

نورانی تھا۔ بزرگانِ دین سے اعتقاد رکھتا تھا۔ نیک نیتی اور خداترسی بچپن سے مصاحب تھی۔ طلوع جوانی میں آکر کچھ عرصہ تک ایسے پرہیزگار نماز گذار رہے کہ کبھی کبھی خود مسجد میں جھاڑو دیتے تھے۔ اور نماز کے لیے آپ اذان کہتے تھے۔ علم سے بے بہرہ رہے مگر مطالب علمی کی تحقیقات اور اہل علم کی صحبت کا شوق اتنا تھا کہ اس سے زیادہ نہیں ہوسکتا۔ باوجودیکہ ہمیشہ فوج کشی اور مہموں میں گرفتار تھا اور انتظامی کاروبار کا ہجوم تھا۔ سواری شکاری بھی برابر جاری تھی مگر وہ علم کا عاشق، علم و حکمت کے مباحثوں اور کتابوں کے سننے کا وقت نکال ہی لیتا تھا۔ یہ شوق کسی خاص مذہب یا خاص فن میں محبوس نہ تھا۔ کل علوم اور کل فنون اس کے لیے یکساں تھے۔ ۲۰ برس تک دیوانی، فوجداری بلکہ سلطنت کے مقدمات بھی علمائے شریعت کے ہاتھ میں رہے۔ جب دیکھا کہ ان کی بے لیاقتی اور جاہلانہ سینہ زوری ترقی سلطنت میں خلل انداز ہے تو آپ کو سنبھالا۔ اس عالم میں جو کچھ کرتا تھا امرائے تجربہ کار اور معاملہ فہم عالموں کی صلاح سے

کرتا تھا۔ جب کوئی مہم پیش آتی یا اثنائے مہم میں کوئی نئی صورت واقع ہوتی یا کوئی انتظامی امر آئین سلطنت میں جاری یا ترمیم ہوتا تو پہلے امرائے دولت کو جمع کرتا۔ ہر شخص کی رائے کو بے روک سنتا اور سناتا اور اتفاق رائے، صلاح و اصلاح کے ساتھ عمل درآمد کرتا۔" (دربار اکبری)

شیخ ابوالفضل کے مرنے پر کیسی اچھی بات لکھی ہے جو بذات خود ایک ضرب المثل ہے۔

"۵۲ برس چند مہینے کا سن، مرنے کے دن نہ تھے۔ مگر موت نہ دن دیکھتی ہے نہ رات، جب آجائے وہی اس کا وقت ہے۔"

عبدالرحیم خانخانان حاتم ثانی کے ذکر میں بلاغت و فصاحت کی جھلکیاں بھر دی ہیں۔ لطائف و ظرائف سے ان کے ذکر کو خوب سجایا ہے۔ مثلاً شیر شاہ کے متعلق ایک لطیفہ ہے جس میں اپنے انداز بیان کا سحر جگایا ہے۔ لطیفہ

"شیر شاہ نے ترقی کی منزلیں طے کرنے میں اتنا عرصہ کھینچا کہ تاج شاہی سر تک آتے آتے خود بڑھاپا آ گیا۔ بادشاہ

ہوا تو سر سفید، ڈاڑھی بگلا، منہ پر جھریاں، آنکھیں عینک کی محتاج، جب لباس پہنتا اور زیور بادشاہی سجتا تو آئینہ سامنے دھرا ہوتا تھا۔ کہتا تھا، عید تو ہوئی مگر شام ہوتے ہوئے۔"

گویا ذوق کے اس شعر

"دیکھا دم نزع دلارام کو　　عید ہوی ذوق ولے شام کو"

کی تشریح آزاد مرحوم نے اپنے اس لطیفہ میں کر دی۔

خان خاناں ہی کے ذکر میں زبان کی چاشنیاں جب رواں ہو جاتی ہیں تو اپنی روانی میں خوب ہی چل نکلتی ہیں اور اس طرح ختم ہوتی ہیں۔

"استغفراللہ کدھر تھا اور کدھر آن پڑا۔ مگر باتوں کے مصالح بغیر تاریخی حالات کا بھی مزہ نہیں آتا۔"

خان خاناں کے جوان بیٹے ایرج کے مرنے پر ایک فلسفیانہ عبارت لکھی ہے اس رواروی میں دولت پر بھی بحث کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ

"سب سے بڑی دولت تندرستی ہے۔ اولاد بھی ایک دولت ہے، علم و کمال، حکومت، امارت، زر و مال غرض یہ سب دولت کے ضمن میں آجاتے ہیں۔"

خان خاناں کے دو بیٹوں کے یکے بعد دیگرے مرنے پر آزاد نے ایک لطیفہ

ایسا برمحل لکھا ہے کہ اس کا ذکر کرنا غالباً بے محل نہ ہوگا۔ لطیفہ

"ایک شاعر کے پاس کوئی شخص آیا اور آبدیدہ ہوکر کہا کہ حضرت بیٹا مرگیا۔ تاریخ لکھ دیجیے۔ روشن دماغ شاعر نے اسی وقت سوچ کر کہا ' داغ جگر۔

۱۲۲۵ھ

دوسرے برس وہی جگر کباب پھر آیا کہ حضرت تاریخ لکھ دیجیے، شاعر نے کہا چند روز ہوئے تم تاریخ لکھوا کر لے گئے تھے۔ اس نے کہا حضرت ایک اور تھا وہ بھی مرگیا۔ شاعر نے کہا اچھا ' داغ دگر۔

۱۲۲۶ھ

جہانگیر نے ان دونوں واقعوں کو اپنی توزک میں لکھا ہے۔ حرف حرف سے درد ٹپکتا ہے۔"

ہم کاغذوں کے دیکھنے والے سہم جاتے ہیں تو ان رشتہ داروں کا کیا حال ہوگا جن کے صرف خیال سے تکلیف ہوتی ہے۔

میاں فہیم کا ذکر بڑے مزے سے کیا ہے۔ وہی میاں فہیم جن کے نام سے ہندوستان کے بچہ بچہ کی زبان پر یہ کہاوت مشہور ہے کہ "کمائیں خان خانان اور لٹائیں میاں فہیم" پھر خان خانان کی امارت اور دریا دلی کے کارنامے قلم بند کیے ہیں۔ یوں تو کئی لطیفے ہیں لیکن یہ دو درخور بحث

معلوم ہوتے ہیں۔ جن میں دریا دلی اور فیاضی کے ساتھ قیافہ شناسی اور رموز آگاہی کے پہلو بھی نمایاں ہیں۔ مثلاً ایک دن خان خاناں کی سواری چلی جاتی تھی ایک شکستہ حال غریب نے ایک شیشی میں بوند پانی ڈال کر دکھایا اور اسے جھکایا۔ جب پانی گرنے کو ہوا تو شیشی کو سیدھا کر دیا اس کی صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ شریف اور خاندانی ہے۔ خان خاناں اسے ساتھ لے آئے اور انعام و اکرام دے کر رخصت کیا۔ لوگوں نے جب اس بے موقع داد و دہش کی وجہ دریافت کی تو کہہ دیا۔ تم نہیں سمجھے اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک بوند آبرو رہی ہے اور یہ بھی اب گرا ہی چاہتی ہے۔ اسی طرح ایک دن خان خاناں کی سواری چلی جاتی تھی۔ کسی راہ چلتے نے ایک ڈھیلا کھینچ مارا۔ سپاہی دوڑے دوڑے گئے اور اس کو پکڑ لائے انھوں نے کہا، ہزار روپیہ دے دو۔ سب حیران کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے، اور عرض کی "جو نالایق قابل دشنام بھی نہ ہو، اسے انعام دینا آپ ہی کا کام ہے۔" جواب دیا کہ "لوگ پھل دار درخت پر ہی پتھر مارتے ہیں، جو میرا پھل ہے وہ مجھے دینا واجب ہے۔"

ان کے بعد مسیح الدین حکیم ابو الفتح گیلانی کا ذکر خیر ہے پھر حکیم ہمام، جن کا اصلی نام ہمایون تھا۔ لیکن اکبر نے ہمام کہہ کر بلایا۔ ان کا تذکرہ ہے،

اور پھر متواتر حکماء و فضلاء کا جا بجا ذکر آیا ہے، سلسلہ کلام میں یہ فقرے بڑے برجستہ ہیں :۔

"یہ خلاصہ روزگار اُبوالفضل، فیضی، حکیم اُبوالفتح حکیم ہمام تھے اور بیربر کا تو کیا کہنا ہے، وہ تو بادشاہ کی دل لگی بلکہ زندگی کا کھلونا تھا۔ ٹوڈرمل نے کارگزاری و مزاج شناسی سے دل میں گھر کرلیا تھا۔ عبدالرحیم خان خانان پہلے انھیں چاروں میں پانچویں سوار تھے اور مان سنگھ چھٹے، پھر مہمات ملکی کے ہیر پھیر میں آکر دور جا پڑے۔ کوکل تاش خاں دودھ کے زور سے ہر مقام پر جگہ لیتے تھے اور اکبر بھی چاہتا تھا کہ یہ ویسے ہی ہوں"

فیضی اور ابوالفضل کے سلسلہ میں مذہب پر کتنی سنجیدہ اور معقول بحث کی ہے، خیالات کیا ہیں مصنف کے ضمیر کا آئینہ ہیں جن سے ان کے کیرکٹر کا زبردست ثبوت ملتا ہے :۔

"مذہب کے معاملہ میں ایک میرا خیال ہے۔ خدا جانے احباب کو پسند آئے نہ آئے، ذرا خیال کرکے دیکھو، اسلام ایک، خدا ایک، پیغمبر ایک، سنی شیعہ کا اختلاف ایک، منصب خلافت پہ

ہے جس واقعہ کو آج ۱۳ سو برس گذر چکے ہیں اس کو از سرِ نو دھرا کر اس قدر طول دینا کہ قوم میں ایک فساد عظیم کھڑا ہو جائے۔ چار آدمی بیٹھے ہوں تو صحبت کا مزہ جاتا رہے۔ کام چلتے ہوں تو بند ہو جائیں۔ دوستی ہو تو دشمنی سے بدل جائے۔ قوم کی اتحادی طاقت ٹوٹ کر چند در چند نقصان گلے پڑ جائیں۔ ہم کتنے کم فہم ہیں جہاں مذہب کا نام آیا کہ آپے سے باہر ہو گئے۔ اس طرح اسلام کے اقبال کو کتنا صدمہ پہنچتا ہے۔ بھلا دنیا کے معاملات میں مذہب کا کیا کام ہم سب ایک ہی منزل مقصود کے مسافر ہیں۔ اتفاقاً گذرگاہ دنیا میں یک جا ہو گئے ہیں۔ راستہ کا ساتھ ہے۔ بنا بنایا کاروان چلا جاتا ہے۔ ہمدردی سے کام بٹاتے چلو گے تو ہنستے کھیلتے رستہ کٹ جائیگا۔ مذہب کے معاملہ میں انگریزوں نے خوب قاعدہ رکھا ہے۔ ان میں بھی دو فرقے ہیں اور ان میں سخت مخالفت ہے۔ پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک دو دوست بلکہ دو بھائی بلکہ کبھی میاں بیوی کے مذہب بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ وہ ایک گھر میں رہتے ہیں۔ ایک میز پر کھانا کھاتے ہیں۔ ہنسنا بولنا، رہنا، سہنا سب ایک جگہ، مذہب کا

ذکر بھی نہیں۔ اتوار کو اپنی اپنی کتابیں اٹھائیں ایک ہی بگی میں
سوار ہوئے اور چلے، ایک کا گرجا راستہ میں آیا وہاں اتر پڑا۔
دوسرا بگی میں بیٹھا اپنے گرجا کو چلا گیا، پھر آئے۔ ایک جگہ بیٹھے،
وہی ہنسنا بولنا، کاروبار، اس کا ذکر بھی نہیں کہ تم کہاں گئے
تھے اور وہاں کیوں نہ گئے تھے جہاں ہم گئے تھے۔

آزاد! کہاں تھا اور کہاں آن پڑا۔ کجا ابُوالفضل اور
فیضی کا حال کجا سنی شیعہ کا جھگڑا۔"

غرض تاریخوں میں صرف خشک تاریخی واقعات ہی ملتے ہیں۔ مگر دربار
اکبری تاریخ کی کتاب بھی ہے اور ادب و انشا کا چمن بھی، اس کے پڑھنے
سے قدیم سوسائٹی آنکھوں میں جینے لگتی ہے۔ اس کے تیوروں کا نقشہ کھینچ کر
سامنے آجاتا ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم اپنے آبا و اجداد کے گروہ میں
داخل ہو گئے ہیں اور کچھ دیر کے لیے ان کے ساتھ رہنے لگے ہیں۔

یہی تاریخی واقعات جب کسی یوروپین کے قلم سے قلم بند ہوتے ہیں تو
ان کا رُخ بدل جاتا ہے، یوروپین اپنی سوسائٹی کے آئین سے خود اتنا بے خبر
رہتا ہے کہ اس کو خود خبر نہیں رہتی۔ گویا سوسائٹی کے حالات اس کے لیے
رازِ دروں پردہ ہوتے ہیں۔ جن سے اس کی لاعلمی ایک بدیہی امر ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ دربار اکبری کی مجلس آرائیاں دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے کہ آزاد میں یہ عجیب و غریب کمال ہے۔ جب کہیں بزم کا نقشہ دکھاتے ہیں تو راحت حیات اور سکونِ زندگی کو مجسم کر کے سامنے لے آتے ہیں۔ رزم کی تصویر اتارتے ہیں تو تلواروں کی چمک دمک الفاظ میں پرتوفگن ہو کر اپنا روپ دکھاتی ہے۔ اس کو پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واقعات ان کے الفاظ و خیالات کے غلام ہیں۔

قلم جہاں چاہتا ہے دست بستہ یا بجولاں قصّوں اور کہانیوں کو سمیٹے ہوئے کھینچ کر لے جاتا ہے۔ کاغذی پیرہن پر گل بوٹے بناتا ہے کہ دیکھنے اور پڑھنے والے ساکت ہو جاتے ہیں۔ ان پر ایک کیفیت سی طاری رہتی ہے۔ کبھی طوفان کی آندھیاں چلاتے ہیں تو اوسان خطا ہو جاتے ہیں، میدانِ جنگ کا ہولناک نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے کبھی نسیم سحر کی ہلکی ہلکی لہروں کو فضائے قرطاس پر رقصاں ہونے کے لیے بلا لیتے ہیں۔ واقعات اصلیت کا بھیس بدل کر دل و دماغ کی کائنات میں نیا جنم لیتے ہیں۔

تتمہ ۶۲ صفحات پر حاوی ہے، جس میں آصف خاں سے ابتدا کر کے ہیمو بقال پر انتہا کر دی ہے۔ ضمیمہ میں دلچسپ اور تاریخی معلومات کا ایک خاکہ ہے۔ اس طرح دربار اکبری ختم کر دی ہے، جس کو زیادہ تر اسم با مسمیٰ

ہی کہنا پڑتا ہے کیونکہ اکبری کارناموں کی ایک داستان ہے اور آزاد کی زبان میں جن کی نسبت کچھ لکھنا ہمارے بس کی تو بات نہیں۔ شعر

ہو جو اس جیسا تو وصف اس کا لکھے　　آج اس جیسا مگر پیدا کہاں

بقول ڈاکٹر سید سجاد "ایک ایسا طرز جس کا مستقبل ناپید ہے"

سیر ایران یہ سیاحت ایران پر لکھا ہوا ایک ۱۸۶ صفحات کا روزنامچہ ہے۔ جناب آغا محمد طاہر نے اس پر دیباچہ لکھا ہے، اس میں اس سفر کو اختیار کرنے کی وجوہ، ترتیب و تشکیل کے اسباب و علل، اس کی نوعیت غرض ساری کی ساری باتیں لکھ دی ہیں۔ وہی شکوہ جو فی زمانا ہر شخص کو ہوتا ہے مثلاً انھوں نے اپنے آبا و اجداد کے کتب خانہ کو بڑھانے اور اس کو از سر نو ترتیب دینے کی ٹھانی، جس کے لیے اکثر ایسے اتفاقات پیش آئے کہ ایک نہ ایک نئی کتاب کی ان کو ضرورت محسوس ہوتی اور باوجود تلاش بسیار وہ نہ ملتی اور ان کی تشنگی حد سے تجاوز کر جاتی، جس کے ثبوت میں انھوں نے کیا معقول بات لکھی ہے۔

"صاحب تصنیف اشخاص جانتے ہیں کہ بعض دفعہ گلستان کا ایک صفحہ دیکھنے کے لیے سکندر نامے کی ضرورت پڑ جاتی ہے اور یہ اس کے دیکھے آگے بڑھنے کو دل نہیں چاہتا۔ اسی رنج میں خدا سے التجا کی کہ اگر مجھے وسعت ملے تو ایک کتب خانہ نظرگاہ خاص و عام میں

آراستہ کروں اور ہر فن کی کتابیں اس میں رکھوں کہ کسی قسم کے
ضرورت مند کو کسی بد دماغ سے التجا کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔"
غرض اس اہم ضرورت کو پیش نظر رکھ کر انھوں نے اپنی آمدنی کا معقول حصّہ
پس انداز کیا، خانہ بربادوں کی سی زندگی بسر کی، اس اثناء میں اگر کوئی کتاب
حسبِ دل خواہ مل جاتی تو کتب خانہ کے لیے خرید لیتے رفتہ رفتہ عرب و ایران کی
دھن سمائی کہ جو کتابیں یہاں نایاب ہیں وہ بہت آسانی سے اور ارزاں قیمت پر
وہاں مل جائیں گی، چنانچہ انھوں نے یہاں سے حرکت میں برکت محسوس کی،
پنشن تو ہو ہی چکی تھی، مگر مصیبتیں تنہا نہیں آتیں، مصائب جب آتے ہیں دیوانہ وار
بادلوں کی طرح امنڈے ہوئے چلے آتے ہیں، انھیں دنوں گردش تقدیر نے
انھیں چند دل شکن صدمے پہنچائے، ان کی جوان بیٹی کی موت ایک قہر آسمانی
بلا بن کر ان پر نازل ہوئی۔ جس حادثہ نے ان کا دماغی توازن بگاڑ دیا، لیکن
چونکہ اس سفر میں کئی اہم مقاصد بھی آ گئے اور خاک وطن کو سفر کا پیوند دکھانا بھی
ایک فرض معلوم ہوا اس لیے رخصت کی درخواست دھڑلے سے پیش کی، اس کے
حاصل کرنے میں بڑی دشواریوں کا سامنا ہوا، لیکن آخر مل گئی۔ ان کے سفر کی
خبر سارے شہر میں آگ کی طرح پھیل گئی، خویش و اقارب نیز احباب نے حتی الوسع
روکنے کی کوشش کی کہ پہلے ہی صدمہ اور ضعف نے ادھ موا کر رکھا ہے سفر دور کا

ہے، لیکن آزاد کا نشہ ان ترشیوں سے نہ اتر سکا، وہ دھن کے پکے اور ارادے کے سچے تھے، انھوں نے سب کو اس کا احساس دلایا کہ ملک جس چیز کا محتاج ہے، قوم کے مستقبل کے لیے جو چیزیں درکار ہیں ان کا مہیا کرنا ان سب سے افضل ہے، خصوصاً فارسی کی جامع اللغات کہ بغیر فارس گئے اس کی تکمیل ناممکن ہے۔

صفحہ ۱۱ سے آزاد کا لکچر ہے، جس میں انھوں نے پبلک کو "شرفائے قوم" کہہ کر مخاطب کیا ہے، یہ لکچر ۴۵ صفحے پر ختم ہوا ہے، اس لکچر میں دورانِ سفر کے حالات ہر شہر کو دیکھنے کے بعد اس کے تاثرات نہایت لطیف پیرایہ میں بیان کیے ہیں، ایک نظر فریب خاکہ کھینچا ہے جس پر سادگی قربان ہے۔
۲۳ ستمبر ۱۸۸۵ء ۶ بجے شام لاہور سے روانہ ہوئے، ۲۵ کو کراچی داخل ہوئے، یہاں پہنچ کر یہ سنا کہ جہاز نکل ہی چکا ہے، چار و ناچار اپنے ایک عزیز و سعید شاگرد مولوی عمرالدین ہیڈ ماسٹر مدرسہ کے مہمان رہے۔ انھوں نے انھیں اتنے خلوص و محبت سے رکھا کہ سفر میں گھر کا لطف آگیا، اور یہ ۸ روز چشم زدن میں گذر گئے۔ ۲ اکتوبر جمعہ کے روز عربیہ (عرب ڈاک کے جہاز سے (للعہ) روپیہ کرایہ دے کر روانہ ہوئے، جہاز کی نقش برآب زندگی کو ایک دلنشیں پیرایہ میں لکھا ہے۔ جہاں جہاں سے جہاز

گذرا ہے وہاں کے مناظر و واقعات کو الفاظ کے خوشنما سانچوں میں ڈھال کر پیش کیا ہے، ۱۰؍ اکتوبر کو ان کا جہاز بوشہر پر دم لیتا ہے، جہاں ۷۔۸ روز ٹھہرتے ہیں، ایک شام ایرانی رہوار کرایہ پر لیا اور کاروان میں جا شامل ہوئے، یہ گھوڑے پر سوار تھے، قافلہ تمام شب چلتا رہا غرض اسی طرح چلتے پھرتے راستہ کی تکلیفیں برداشت کرتے، کچھ سوار کچھ پیدل شیراز پہنچتے ہیں، جہاں پر کچھ اپنے مطلب کی شراب انھیں ملتی ہے، یعنی کتابیں، جن کی جستجو انھیں یہاں کھینچ لائی، شیراز کے اطراف و اکناف میں گھومتے ہیں وہاں کے مقامات کی نسبت جو بیان ہے اس کو فارسی میں لکھا ہے، خواجہ حافظ اور شیخ سعدی کا وطن ہونے سے شیراز کی ہر دلعزیزی، وہاں کے مدارس کا حال اور ان کا ہندوستانی مدارس سے تقابل، حافظ و سعدی کی قبر کی زیارت، شیخ سعدی کی قبر کا کتبہ تمام کا تمام نقل کیا ہے، اس شعر سے جس کی ابتدا ہوتی ہے۔

کریم السجایا جمیل الشیم　　　نبی البرایا شفیع الامم

غرض شیراز کی ہر نبض دیکھی ہے، وہاں کے اس مشہور تحفہ گل گُل کا بھی ذکر ہے، یہ خوشبو میں بسی ہوئی ٹکیاں ہوتی ہیں جن سے لوگ سر اور ڈاڑھی دھوتے ہیں اور یہ شیراز کا مشہور تحفہ ہے، اس کو دیکھنے سے آزاد کو

گلستاں کا وہ سبق یاد آیا۔

رگل خوشبوئے در حمام روزے

پھر لکھتے ہیں "شیراز جب دیکھ لیا تو بڑھاپے نے خوف کے لحاف میں دبک کر کہا اب اصفہان دیکھ اور آگے بڑھ کہ تلاش کی منزل ابھی دور ہے"۔ اب یہ قافلہ کے ساتھ اصفہان جا رہے ہیں، راستہ میں جو مناظر پڑتے ہیں ان کے بیان میں شاعرانہ گھلاوٹ موجزن ہے۔ شاہ عباسی کی سراؤں کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے جن کی پختگی اور وسعت قلعوں کو ٹکر مارتی تھی، ان سراؤں میں اگر مسافر روپیہ رکھتا ہو تو خاطر خواہ سامان آسائش کا اس کو مل سکتا ہے۔ چار پانچ آنے کو مرغ اور پیسے کے دو دو انڈے، تر و خشک میوے نہایت اعلیٰ اور ارزاں ملتے ہیں۔ اسی طرح تمام راستہ آب رواں سے سبز و شاداب آبادیوں سے معمور ملا۔ جہاں ٹھہرتے وہاں کے اہل علم کا پتہ دریافت کرتے اور ان سے جا ملتے، زندہ رود (وہ دریا جس نے اصفہان کا تمام علاقہ زندہ کر رکھا ہے) دیکھ کر بے خود سے ہو جاتے ہیں اور شعرا کے اس تخیل کی تائید کرتے ہیں۔

جہاں را اگر اصفہانے نبود جہاں آفریں را جہانے نبود

یا پھر اپنے تجربہ اور مشاہدہ کی بناء پر اس خیال کو تسلیم کرتے ہیں۔

اصفہان نیمۂ جہاں گفتند نیمۂ وصف اصفہان گفتند

ایک جگہ لکھا ہے "یہ شہر سلاطین صفویہ کی ہمتوں کا عجائب خانہ ہے"۔ سفر میں بڑی تکلیفیں بھی اٹھائیں، کہیں فاقہ گذرا، کہیں سیر ہو کر کھایا۔ اب اصفہان سے پندرہ منزلیں طے کر کے طہران پہنچتے ہیں، لوگ اسے ایران کا دارالخلافہ کہتے ہیں، لیکن حقیقت میں شاہ کی برکت ہمت سے آج علوم و فنون تہذیب اور دولت و اقبال کا دارالخلافہ ہے، طہران کا ذکر بھی کافی تفصیل سے کرتے ہوئے اصل مدعائے سفر یوں ظاہر کیا ہے۔

"مجھے اس سفر میں بڑی غرض کتابوں کی تلاش تھی اور اس سے زیادہ یہ خیال کہ جامع اللغات فارسی کے لیے سرمایہ جمع کروں، چنانچہ وہاں کے صاحب علم و فضل کے حضور میں پہنچا، انھوں نے کتب خانہ آزاد کے لیے دو دو نسخے کتابوں کے دیے"

پھر طہران میں ٹھہرنے کی بڑی دو ضرورتوں کا ذکر ہے۔ "اول کتابیں دوسرے تحقیقات الفاظ" یہاں سے مشہد مقدس کا رُخ کرتے ہیں، طہران و مشہد کے واقعات بھی سب فارسی میں لکھے ہیں، مشہد سے سمنان جاتے ہیں جہاں سے شعر سمنان اور انار سمنان لوگ تحفتہً لے جاتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں دامنان، شاہ رود، بسطام، سبزوار، نیشاپور سب ہی دیکھ لیا،

مشہد سے ہرات چلے ہیں۔ اسی سفر میں ایک حادثہ سے دوچار ہوتے ہیں۔ قافلہ شتری تھا، غفلت کی نیند سو رہے تھے کہ اونٹ سے گر پڑے۔ ایک پسلی ٹوٹ گئی۔ غرض یوں تیوں ہرات پہنچتے ہیں۔ جہاں ۲۸ دن قیام رہا اور جو تجربے ہوئے اس کا یوں ذکر کیا ہے۔

"مجھے یہاں ایک ایک دن پہاڑ تھا، سب سے زیادہ تنگ کرنے والی چیز وہاں کے بچہ سے لے کر بوڑھے تک کے پیہم سوالات تھے، جن سے طبیعت اکتا گئی تھی۔ کہاں سے آتے ہو، کیوں آئے ہو، کس راستہ آئے ہو، غرض ہر نوع کے سوالات"

بے کار و بے ضروری بحث جس سے یہ قریب قریب بیزار تھے اور ایران کو یاد کرتے تھے کہ وہاں مہینوں رہا مگر کبھی جی نہیں اکتایا، ہرات ایک ویران شہر تھا مگر اندرون شہر گوہر شاد بیگم کی بنائی ہوئی مسجد جو اپنے علوئے رفعت و شان میں خدا کی یاد تازہ کر دیتی تھی اس شہر کی رونق کو بڑھا رہی تھی، لیکن ۱۸۸۵ء میں سلاطین تیموری کے ٹکڑوں نے اسے پامال کر دیا۔ ثابت یہ ہوا کہ شہر ہرات ۱۸۰۹ء سے ۱۸۵۵ء تک شہزادگان تیموری کی قسمت آزمائی کا دنگل بنا رہا پھر مختلف مناروں، مقبروں اور مساجد کا ذکر ہے۔ مولانا جامی کی قبر کی بھی زیارت کی۔ پس ہرات سے قندھار

چل پڑے۔ ۲۶ دن میں قندھار کی منزل طے ہوئی، بعد مسافت کا سبب ملک کی ویرانی اور غیر آبادی تھی راستے میں بڑے مصائب جھیلے۔ بعض اوقات سوکھی روٹیاں پانی میں ڈبو کر کھائیں۔ ہم سفر اشخاص نے انھیں کافر سمجھا، اس طرح آزاد کو اثنائے سفر میں "کافر بننے کا بھی اتفاق ہوا" قندھار میں ۵ روز قیام کیا، وہاں بھی وہی سوال وجواب نے انھیں پریشان کیا جن سے پیچھا چھڑا کر ہرات سے نکلے تھے، وہاں سے کوئیٹہ روانہ ہوئے جہاں صرف ایک روز رہ کر دوسرے دن چھکڑے پر کتابیں لادیں اور دو دن ایک رات میں بمقام رندلی پہنچے، اس طرح ان کا سفر ۱۸۰ صفحات کے حجم پر محیط ہے۔

خاتمہ، طاہر صاحب نے لکھا ہے جس میں سیر ایران پر ایک تنقیدی نظر ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ آزاد نے یہ سفرنامہ کیونکر مرتب کیا جو مصنف کے اصلی جذبات وکیفیات کا آئینہ ہے، جہاں فارسی لکھی ہے اس کی شان ہی نرالی ہے، روزنامچہ کا لحاظ کرتے اُردو کی آن بان الگ ہے۔

سخندانِ فارس | اُردو زبان میں سب سے پہلے لسانی مساعی سے آزاد نے بحث کی ہے، ان کی یہ کتاب پڑھ پڑھ کر لوگوں نے ہندوستان میں سب سے پہلے یہ سمجھا کہ زبان کی تاریخ بھی علم وفن کا کوئی شعبہ ہے، اگرچہ

یورپ میں بھی اس فن کی ابتدا کو کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا۔ ویبر
نے ویدک اور سنسکرت زبان کی بحث ۱۸۵۰ء کے قریب اور میکسمر
نے بھی اسی زمانے کے لگ بھگ اس کا بیڑا اٹھایا، ان لوگوں کے بعد ہی
آزاد نے ان مباحث کو اُردو زبان میں چھیڑ دیا، جن مباحث کو بیان کرنے
کے لیے ہماری زبان میں زبان نہیں ہے۔ انھیں مباحث کے لیے اُردو زبان کو
اپنے قدیم مقام سے اٹھا کر انھوں نے نئے خیالات ادا کرنے پر لگایا ہے۔
حقیقت میں یہ فن کسی ماہر کاریگر کی چابک دستی کا محتاج تھا اور اپنے
عہد طفولیت میں پڑا تھا، اس کے مسایل پر کامل روشنی نہیں پڑی تھی مگر
خیر جو کچھ بھی تھا انھوں نے اس کو سمجھا اور اس زبان میں سمجھایا جس کو
حوادث عالم کی ہوا تک نہ لگی تھی اور یہ آزاد ہی کا حوصلہ ہے کہ وہ زبان پر
ایسی قدرت رکھتے ہیں۔ بس اس طرح زبان کا فطری شوق جو قدرت
نے ان میں رکھا تھا وہ زبان کے عالمانہ اور محققانہ تیور دیکھ کر اور بھی
چمک اٹھا۔ چنانچہ یہ عقدہ اب ہم پر اچھی طرح کھل گیا کہ آزاد نے نہ صرف
اشخاص کی تاریخ ہی لکھی ہے بلکہ زبانوں کی بھی تاریخ لکھی۔ نہ صرف تاریخ
بلکہ یوں کہیے کہ فلسفہ زبان کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے اور اس
راستہ سے دنیائے ادب کو روشناس کیا ہے۔ یعنی زبان کی اصل، ایک زبان کا

دوسری زبانوں سے تعلق، الفاظ کی اصل اور معنی کے تغیرات کے اسباب سے بھی عالمانہ بحث کی ہے، بقول مولانا سعید انصاری بی اے

"یہی علم آج مدون صورت میں علم الالسنہ یا انگریزی میں "فیلالوجی" کے نام سے موسوم ہے جس کا شوق انہیں اہل یورپ کی غیر زبانوں میں تحقیق و تفتیش کو دیکھ کر پیدا ہوا۔ چنانچہ انھوں نے سب سے پہلے فارسی زبان کی تاریخ و تحقیق کی طرف توجہ کی اور اس کے لیے ایران اور بخارا وغیرہ کی دشوار گذار مسافت بھی اختیار کی۔"

اس طرح آزاد نے ایران وغیرہ کے قدیم رسم و رواج کا مقابلہ ہندوستان کے رسوم کے ساتھ کیا ہے اور اپنی سیاحت ایران کے دلچسپ حالات موقع موقع پہ درج کیے ہیں، نہ صرف سیاحت و مسافت بلکہ وہاں کے میلے ٹھیلے دیکھے، شادی و غمی کی محفلوں میں حصہ لیا اور یہ مواد تیار کیا۔ (غرض ان کی اس علمی و لسانی تحقیق و تدقیق کا اصلی مظہر "سخندان فارس" ہے جو بذات خود فارسی زبان کی ایک مکمل تاریخ ہے۔ یہ مصنف کی پندرہ برس کی محنت و جاں کاہی کا ثمر ہے اور نہایت قابل قدر و دلچسپ کتاب ہے) علاوہ سفر کے حالات اور اپنے ذاتی دلچسپ تجربوں کے قابل مصنف نے اس میں مختلف زبانوں کے

مقابلہ سے قوموں کے باہمی رشتوں کے مٹے ہوئے سراغ لگائے ہیں۔ ژند، پہلوی، دری سنسکرت کے الفاظ کا مقابلہ کرکے تاریخی نتائج نکالے اور مشہور مصنفین کی نظم و نثر کے مابہ الامتیاز پہلو دکھائے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ زبان فارسی کی ایسی تاریخ اب تک ہندوستان میں اس سے قبل نہیں لکھی گئی۔ فیلالوجی کا فن زبان کے رو شناسوں کے لیے آسان کر دیا۔

آغا محمد طاہر اس کی نسبت دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

"سخندان فارس نام تو آپ کی کتاب کا ہے مگر درحقیقت سخندان فارس خود بدولت ہی تھے۔ فیضی، ابوالفضل ہوں یا ہمارے مرزا غالب مرحوم ان حضرات نے فارسی کی تحقیق و تدقیق میں حضرت آزاد جیسی کاوش اور محنت نہیں اٹھائی، ان حضرات کی بڑی عرق ریزی یہ تھی کہ اپنے گھر میں یا اپنے شہر میں فارسی دواوین، فارسی علم ادب کی کتابیں یا فارسی زبان کے لغت اور فرہنگیں پڑھ لیں یا ترک افغان وغیرہ جو ایران و توران سے دلی، آگرہ وارد ہوئے ان کی گفتگو سن کر اپنے ذہن رسا اور حافظہ خداداد کے ذریعے سے محاورے یاد کر لیے، مگر قصہ زمین بر سرزمین پورا ہوتا ہے، فارسی زبان کی

تحقیق کے لیے ان میں سے ایک صاحب بھی دلی کے کابلی دروازہ سے باہر نہ نکلے۔ یہ حضرت آزادؔ ہی کا جگر اور حوصلہ تھا کہ سفر کی مصیبتیں اور تکلیفیں جھیل کر فارس کی سرزمین میں پہنچے۔"

اس کا حجم ۴۱۳ صفحے ہے۔ یہ جامع تاریخ لسان مندرجۂ ذیل پر مشتمل ہے۔ تمہید خود آزاد نے لکھی ہے جس کی تاریخ ۵ اگست ۱۸۸۷ء ہے، لیکن یہ چھپی ۱۹۰۷ء میں۔

حصۂ اول میں علم اللسان پر بحث کی ہے۔ لغات اور زبانوں کے فلسفیانہ تحقیقاتی اصول بتائے ہیں، انسان کے حیوان ناطق ہونے پر ایک مدلل بحث ہے جس میں فن تقریر کی ہندی کی چندی کردی ہے۔ زبان کے جینے اور مرنے کے اسباب بتائے ہیں کہ اس کے ہست و بود کا دار و مدار کس پر ہے۔ وہ کیونکر پنپ سکتی ہے۔ سنسکرت اور فارسی کا بہناپا کہ کیسے ایک کا گہرا لگاؤ دوسرے سے ہے۔ مثلاً

آستان فارسی میں گھر کی دہلیز کو کہتے ہیں، ستان کثرت ظرفی کے لیے آتا ہے۔ جیسے گلستاں، بوستاں سنسکرت میں ستھاں عموماً جگہ کو کہتے ہیں۔

شنا فارسی، اردو اس کی تیرنا، سنسکرت میں سنان نہانا اور ظاہر ہے کہ بے نہائے کے تیرنا کب ہو سکتا ہے۔ اسی طرح سینکڑوں الفاظ کا حوالہ

دے کر ثابت کر دیا ہے کہ فارسی اور سنسکرت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

پھر ۵۰ - ۶۰ صفحوں میں فارسی اور سنسکرت کے متحد الاصل لفظوں میں کن اصول کے بموجب تبدیلیاں ہوئی ہیں اس پر ایک مبصرانہ بحث ہے۔

(حصۂ دوم میں آزادؔ مرحوم کا پہلا لکچر "فارسی قدیم کی تاریخ" پر ہے ایران و اصفہان کی تعریف میں دریا بہا دیے ہیں۔ مثلاً

"ایرانیوں کی مہمان نوازی، ان کے آداب محفل ان کی تعظیم و تکریم کے طریقہ ان کے گھروں کی آرائش آج تک علم تدبیر المنزل کے لیے نمونہ ہیں۔ اتنی بربادیاں اٹھا کر جب اس کا یہ حال ہے تو اس وقت کیا عالم ہوگا۔ یہی سبب ہے جو یورپ کے اہل نظر نے پیرس دار الخلافہ فرانس کی زیبائی اور خود آرائی دیکھ کر اسے خاتون دنیا کا خطاب دیا اور مورخوں نے کہا کہ جس طرح وہ یورپ میں خاتون ہے ملک ایران ایشیا میں خاتون ہے۔"

(دوسرے لکچر میں ملک فارس کی پرانی زبانوں کے حالات درج ہیں۔ تیسرے میں یہ بتایا ہے کہ فارسی زبان نے اسلام کے بعد کیا کیا رنگ بدلے چوتھے میں فارس کی مروجہ زبان میں دوسرے انقلاب پر بحث کی ہے۔

پانچویں لکچر میں قدمائے وارس کے اصول شرعی اور رسوم عرفی بتائے ہیں۔ چھٹے میں اسلام کے بعد اہل ایران کے آداب ورسوم اور رہنے سہنے کے طریقوں پر روشنی ڈالی ہے، ساتواں لکچر آزاد کی رنگین بیانی کا ایک دلچسپ مرقع ہے۔ اس میں انھوں نے اپنی جادو بیانی کوٹ کوٹ کر بھردی ہے یعنی ہر ملک کی سرزمین اور اس کے موسم کی بہار انشا پردازی پر کیا اثر کرتی ہے مثلاً ان کے اس لکچر کا ایک لطیفہ جو خود انھیں کے مخصوص انداز بیان کا نمونہ ہے اس کا یہاں نقل کرنا خالی از دلچسپی نہیں۔ پہلے تو یہ کہ تقریر کے دوران میں لطائف وظرائف کا لانا تقریر کی یکسانیت اور اداسی میں ایک رونق اور چہل پہل پیدا کردیتا ہے، آزاد کے بالعموم ہر لکچر میں کچھ نہ کچھ لطیفے ہوتے ہیں۔ لکھتے ہیں لطیفہ

"تین شخص ہم سفر تھے۔ سنار، پنیر والا، اور نان بائی شام کو ایک جگہ جنگل میں اترے، بستر ایسے مقام پر ہوئے کہ سامنے کوسوں تک کھلا میدان تھا، منہ ہاتھ دھویا، کھانا کھایا۔ جب کچھ رات ہوگئی، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی، دل شگفتہ ہوئے، ۱۳-۱۴ تاریخ تھی، چاند سامنے سے سر نکالا سنار نے کہا، آہا کندن ڈلک ڈلک کرتا ہے، ابھی کٹھالی سے سر نکالا ہے۔ پنیر والا بولا ثابت چکتی ہے، ابھی چاکو نک

نہیں چھوایا۔ نان بائی نے کہا، یہ تو میرے تنور سے پھڑپھڑاتی روٹی نکلی ہے، دیکھو جو شخص جس جس حال میں تھا ویسے ہی خیال اس کے دل میں پیدا ہوئے۔ شعر

گر خیالت گلشن است تو گلشنی   ور خیالت گلخن است تو گلخنی"

اسی لکچر میں فصحائے عرب اور ہند کے انشاء پرداز کا مقابلہ کرنے میں اپنی سحر بیانی کا کافی ثبوت دیا ہے مثلاً

عرب کا فصیح البیان جب معشوق کی تعریف کرتا ہے تو آنکھ کو ہرن یا گاو دشتی کی آنکھ کہتا ہے۔ زلف کو کویلہ یعنی زغال کہتا ہے اور جب بالوں کے رنگ و بو کو زیادہ چمکاتا ہے تو لونگیں بھی پیس کر ڈالتا ہے، مگر مشک و عنبر کی بو سے بھی غافل نہیں ہے، ہونٹوں کا سیاہی مائل ہونا قابل تعریف سمجھتا ہے، ملک گرم ہے، رنگ کالے ہیں، دانتوں کو کبھی اولا کبھی گل بابونہ کہتا ہے، انہیں چمکاتا ہے، مگر مسوڑوں پر سرمہ چھڑک کر سیاہ کرتا ہے، گردن کو بت کی گردن سے تشبیہہ دیتا ہے، آں حضرت صلعم کے حلیہ میں "جیدہ کجید دمیۃ" لکھتا ہے۔

ہند کا انشا پرداز زلف کی تشبیہہ میں بھونرے اڑاتا ہے اور سانپ کے پھن بھی لہراتا ہے، آنکھ کے لیے کنول کے پھول دکھاتا ہے۔ ممولے کی

اچپلاہٹ دکھاتا ہے، جی چاہتا ہے تو ہرن سے بھی آنکھ لڑا لیتا ہے، دانت موتی کی لڑیاں ہیں۔ یہ تشبیہ مشترک ہے، ناک کو طوطے کی چونچ سے تشبیہ دیتا ہے کہ خاص ہند کا جانور ہے، غرض اسی نہج سے معشوق کا سراپا کھینچا ہے، ہند و عرب کی انشاپردازی کے بیان کرنے میں اپنی رنگینی بیانی کے گل بوٹے کھلائے ہیں، ایران کے ہر موسم کا ایک دلاویز خاکہ کھینچا ہے اور اس کو اپنی خوش بیانی سے سجایا ہے۔

(آٹھویں لکچر میں زبان فارسی کے انداز بیان کو اور زبانوں کے اندازِ بیان سے جو نسبت ہے اس پر بحث کی ہے) اس لکچر کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں "آج کا لکچر اس مضمون پر ہے جو فارسی کے عالم کا نفس ناطقہ ہے" اور ایشیائی زبانوں کے اہل ذوق کے اس مقولہ پر "فارسی شکر است، ترکی ہنر است ہندی نمک است" پر ایک معقول و مدلل بحث کی ہے۔

(نواں لکچر فارسی اور عربی کے ملاپ سے جو رنگ نکھرا اس پر محیط ہے، دسویں لکچر میں یہ بتایا ہے کہ فارسی پر ہندوستان آکر کیا کیا رنگ چڑھے، گیارہویں میں نظم فارسی کی تاریخ قلم بند کی ہے) اس میں بھی ایک لطیفہ یعقوب ابن صفار کا لکھا ہے، جن میں اس نے اپنے خورد سال بچے کی زبان سے الڑھ پن میں نکلے ہوئے فقرے پر جو بذات خود ایک مصرعہ تھا۔

علمائے وقت کو حکم دیا کہ اس کا قاعدہ باندھو، چنانچہ انھوں نے اس مصرعہ کی تقطیع کی اور بحر ہزج کی ایک شاخ نکالی اور اس کے بعد اس کے بڑھتے بڑھتے یہاں تک نوبت پہنچی، پھر طبقات شعرائے فارسی کا ایک خاکہ کھینچ کر بتایا ہے کہ کس عہد میں کون کون شعراء گذرے ہیں، اسی سلسلہ میں آدم الشعراء رودکی کے کلام پر بحث کی ہے، پھر فردوسی پر اپنے قلم کا نکھار ختم کردیا ہے، محمود غزنوی اور بدقسمت فردوسی کے قصہ کو جس کو ہزار بار سننے سے بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی اپنے زور قلم سے یوں آراستہ کیا ہے:۔

"اس کی نظم کے دبدبہ سے دربار گونج اٹھا، محمود بہت خوش ہوا، نظم شاہنامہ کے لیے حکم دیا ایک اشرفی فی شعر انعام مقرر کیا، فردوسی نظم شاہنامہ میں مصروف ہوا۔ وہ اس کی محنتوں کا کارنامہ اور عمر بھر کی کمائی ۶۰ ہزار شعر کا مجلا ہے ۳۰ برس کی جگر خراش میں تیار ہوا، چنانچہ خود لکھتا ہے شعر

بسے رنج بردم دریں سال سی — عجم زندہ کردم بدیں پارسی"

شاہنامے کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے رستم کے ساتھ دلی محبت تھی، جیسے ایک بچہ کو پال پوس کر کوئی پروان چڑھاتا ہے اور اس کی بہار زندگی دیکھ کر خوش ہوتا ہے، یہی حال اس کا ہے۔ اس نے رستم کے

کارناموں کو اس جوش وخروش سے لکھا ہے کہ کسی کا حال ایسا نہیں لکھا گویا اس تصنیف سے مقصود اسی کا حال سنانا تھا اوروں کا بہانہ تھا۔ شعر

جہاں آفریں تا جہاں آفرید   سوارے چو رستم نیامد پدید

پھر ناصر خسرو، اسدی طوسی، عنصری، منوچہری، فرخی وغیرہ کے کلام پر ایک مختصر سی بحث کی ہے اور یہی آخری لکچر ہے، آخر میں خاتمہ پر اہل طلب کے تقاضوں سے جو کتاب کو ختم کر دینا پڑا ہے اس کا ذکر کیا ہے۔

تاریخ خلیفہ سید محمد محسن صاحب متخلص بہ متینؔ نے لکھی ہے یہ مقطع ہے۔ شعر

کہ۔ ہین۔ شتاب بگو اے متینؔ بلا کم وکاشت

بسا مفید سخندان فارس از آزاد۔

۱۳   ھ   ۲۴

نگارستان فارس اس سلسلہ کی دوسری کڑی ہے جس میں زودکی سے لے کر واقف بٹالوی تک کے مشاہیر شعراء کی سوانح عمریاں ہیں حالاتِ زندگی کے ساتھ ساتھ کلام بھی درج ہے، یہ بھی آزاد کا تاریخی کارنامہ ہے، اس کتاب کو آغا محمد طاہر نے ۱۹۲۲ء میں طبع فرمایا، ۲۳۲ صفحات اس کا حجم ہے، آخر میں "عرض کیفیت" کے عنوان سے طاہر صاحب نے اظہارِ حال

کیا ہے جو ہم صفحوں پر محیط ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"افسوس کہ اس وقت علامہ شبلی زندہ نہیں، وہ ہوتے تو اس تذکرہ کو دیکھ کر حضرت آزاد کے کمال کی داد دیتے، کیونکہ" وائے برجان سخن گر بہ سخندان نہ رسد" قدر جوہر شاہ داند یا بداند جوہری۔

وہ خود مورخ اور تذکرہ نویس فارسی کے زبان دان اور شاعر مجمع علوم و فنون تھے، حضرت آزاد کی کتابوں کو بہت عظمت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اہل کمال اپنے ہم پیشہ وہم رتبہ کی ضرور تعظیم کرتے ہیں۔"

اس میں تاریخ کو ادبی رنگ میں پیش کر کے، ہر قصہ میں ایک نیا پہلو اختیار کیا ہے۔ مثلاً ایک مقام پر میر معزالدین موسوی خان فطرت (عہد عالمگیر کا ایک صاحب کمال تھا) کے بیان میں ایک لطیفہ قابل ذکر ہے۔

"ایک دن کوئی شاعر یا وہ گو اپنے اشعار میر کو سناتا تھا اور داد چاہتا تھا، کسی مقام پر ایک لفظ غلط ایسا بیہودہ باندھا تھا کہ میر نے ٹوکا۔ اس نے کہا کہ ضرورت شعر کے لیے، میر نے کہا تمہیں شعر کہنا کیا ضرور تھا۔"

ایک اور موقع پر لکھا ہے۔

"میر نے ایک دن اپنی ولادت کی تاریخ خود اس طرح بیان کی کہ افضل اہل زمانہ، سرخوش نے عرض کی کہ میں بھی

۱۰۵ھ

اسی سال پیدا ہوا ہوں یہ تو مجھے عنایت ہو کیونکہ میرا تو نام بھی افضل ہے۔ آپ اپنے لیے اور کہہ لیجیے گا، ہنس کر کہا' اچھا خدا مبارک کرے۔"

آغا طاہر کو یہ کتاب کس طرح ہاتھ آئی اس کے بیان میں خود انھیں کا طرزِ بیان ملاحظہ ہو:۔

"حضرت والد صاحب کے انتقال کے بعد جب میں لاہور آیا تو سب سے پہلے عبرت کی نگاہیں انہیں پلندوں پر پڑیں، حیران ہو گیا کہ افسوس حضرت آزاد کے جسمانی فرزند تو یوں خاک کے پیوند ہو گیے اور یہ معنوی فرزند جنھیں مولانا اپنے بچوں سے زیادہ عزیز جانتے تھے اور جان چھڑکتے تھے، ان پھٹے پرانے بستوں میں سوتے کے سوتے رہ جائیں گے، حضرت آزاد تو اب بار بار آنے سے رہے، جو انھیں بنائیں گے، سنواریں گے اور ایک سے ہزار کر کے نکالیں گے، اب تو یہی غنیمت ہے کہ اس بہتے دریا میں سے جو کچھ بھی ہاتھ آجائے، ان تمام باتوں کو سوچ کر ان مسودوں، بستوں اور گٹھڑیوں کو کھولنا شروع کیا۔ کیا بتاؤں کہ ایک ایک کاغذ کا ورق لاکھوں جانداروں کے کلیجے سے لپٹا نظر آتا تھا،

کیڑوں کی فوج کو کمال ہمدردی کے ساتھ رخصت کیا گیا۔ غرض
اسی طرح روزانہ دو تین گھنٹے اس پھونکا پھانکی میں صرف ہونے
لگے، انھیں دنوں میں ایک دفعہ جناب میر ممتاز علی صاحب سے
ملنا ہوا تو باتوں باتوں میں مولانا کی غیر مطبوعہ کتابوں کا بھی ذکر
نکل آیا، اس سلسلہ میں انھوں نے فرمایا کہ دیکھنا بھئی استاد
آب حیات کی طرح ایک تذکرہ فارسی شعرا کا بھی لکھا تھا، تم
ذرا خیال رکھنا، مجھے معلوم تو پہلے بھی تھا مگر اب یقین ہوگیا اور
اس کی ٹوہ میں رہا حسن اتفاق دیکھیے کہ ایک دن بستہ کھول کر
بیٹھا تھا کہ سامنے ابو عبد اللہ رودکی نام لکھا نظر آیا، دیکھا تو
اکثر مسودہ نگارستان کا تھا، اسی وقت میر صاحب کے پاس
گیا، انھوں نے پہچانا تو مجھے کامل یقین ہوگیا کہ

قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

نگارستان کا قلمی مسودہ مختلف بستوں میں سے ملا۔ ایک جگہ جمع
کیا تو تقریباً مکمل ہوگیا۔ تمام مسودہ خوش خط لکھا ہوا تھا سوائے
چند شعراء کے حال کے جن کا پڑھنا۔ ع

صبح کرنا شام کا لانا تھا جوئے شیر کا

ان کے علاوہ ایک دو پرچے بالکل ناقابل رکھنے اور پڑھنے کے ملے جنھیں پنسل کی نوشت نے حرف غلط کی طرح مٹا دیا تھا۔ مگر نظر گڑا دینے سے معلوم ہوا کہ غالباً مرزائے فارسی حضرت غالبؔ کا ذکر ہے جن کو مولانا نے آبِ حیات میں بھی فارسی شاعر مانا ہے۔

بعض شعرا کے انتخاب کلام بھی نہ مل سکے۔ کیا جانے حالتِ جذب میں کہاں سے کہاں باندھ دیے، دو تین جلیل القدر شاعر بھی رہ گئے۔ مثلاً عمر خیام ابن یمین وغیرہ۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود بھی اس قدر شعرا کسی اُردو کے تذکرہ میں نہ ملیں گے۔"

غرض آغا صاحب کی ہستی قابل قدر ہے اور باعثِ برکت کہ ان کے وجود مسعود نے آزادؔ کے عمر بھر کی کمائی و پونجی کو جو اسرارِ غیب کی طرح سربستہ تھی منصۂ شہود پر لانے کے سامان پیدا کیے اور انھیں اس ادبی شہسواری کا مردِ میدان بنایا۔ وہ خود "عرض کیفیت" کے خاتمہ پر اپنی خود ساختہ داستان کو اس جملہ سے ختم کرتے ہیں۔ "کلمبس کو نئی دنیا دینے والے نے اس کے

بعد مجھے بھی پے در پے مولانا کے غیر مطبوعہ جواہر ریزے دلوائے، جو انشاء اللہ بہت جلد ہدیۂ نظر ہونگے۔"

مکتوبات آزاد اس کتاب کی نسبت حضرت ناصر نذیر فراقؔ دہلوی دیباچہ میں لکھتے ہیں :۔

"آزاد کے چاہنے والوں نے بہت چاہا کہ آزاد کی انشاء آپ کی شان اور درجہ کے موافق ضخیم بھی ہو، دلچسپ بھی، مفید بھی۔ کچھ نہیں تو غالب کی اُردوئے معلّیٰ اور عودِ ہندی جیسی تو ہو۔ مگر یہ مراد پوری نہ ہوئی شیخ عبد القادر صاحب بیرسٹراٹ لا نے سارے ہندوستان میں دہائی دی کہ جن صاحبوں کے پاس حضرت شمس العلماء آزاد کے خطوط یا رقعات یا مکتوب ہوں وہ ازراہِ ہنر پروری ہمارے پاس بھیج دیں تاکہ ہم انہیں چھاپ دیں اور جو مولانا کے کمال کے بھوکے ہیں، انہیں فائدہ پہنچے۔ مگر سوائے جناب میجر سید حسن صاحب بلگرامی کے کسی اللہ کے بندے نے جواب تک نہ دیا۔ میجر صاحب ممدوح نے دریا دلی سے کام لیا اور آپ کے پاس جو ۳۰ - ۳۲ خط حضرت آزاد کے قلم جواہر رقم کے لکھے ہوئے رکھے تھے وہ بے دریغ بیرسٹر صاحب ممدوح کے

پاس بھیج دیے اور بیرسٹر صاحب دام اقبالہٗ نے وہ خطوط وقتاً
فوقتاً اپنے رسالہ مخزن میں شایع کیے۔ خط کیا جواہر کے ٹکڑے تھے
جن کی خریداری کے لیے سارا ہندوستان امنڈ پڑا۔"

مکتوبات کا یہ مجموعہ ۲۷۴ صفحات کی تصنیف ہے، آزاد مرحوم کے دلچسپ خطوط جو گوناگوں دلفریبیوں کا مجموعہ ہیں وہ اس کی کائنات ہے ان میں اکثر و بیشتر خطوط دوستوں اور شاگردوں کے نام لکھے ہیں۔ طاہر صاحب نے اس بیش بہا تصنیف کو مرتب اور سر عبدالقادر کے نام معنون کیا ہے۔ اس تمہید کے بعد مولانا آزاد کا ایک قلمی خط اپنے فرزند محمد ابراہیم کے نام ہے۔ جو ۵ر جون ۱۸۸۶ء کا لکھا ہوا ہے، دوسرے صفحہ پر ان کی تصویر ہے۔ پھر مصور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب نے دیباچہ لکھا ہے ۸ صفحے اس کی تعریف اور اس کے اغراض و مقاصد میں رنگے ہیں، گیارہویں صفحے سے ۳۵ صفحے تک حضرت ناصر نذیر فراق دہلوی نبسۂ خواجہ میر درد مرحوم نے ایک دلچسپ داستان لکھی ہے، جس میں اپنی شاگردی کا ذکر، مولانا آزاد سے ملاقات، ان سے شرف تلمذ کا زرین موقع، آزاد مرحوم کی دیوانگی کے آخری ایام کا عبرت انگیز قصہ بیان کیا ہے، اب یہاں سے مکتوبات آزاد کی ابتداء ہوئی ہے، سب سے پہلا خط میجر سید حسن صاحب بلگرامی کے نام ہے۔ اس خط میں

اپنی انتہائی عدیم الفرصتی کا ذکر ہے۔ ”خطوط اور کارڈوں کا ایک انبار پڑا ہوا ہے اور دو دو حرفوں میں سب کو ٹال رہا ہوں“ دوسرے خط میں میجر صاحب کو عورتوں کے تذکرہ پر اشارے بتائے ہیں۔ مشہور شاعرہ خواتین کا ذکر ہے مثلاً گلبدن بیگم ہمایوں کی بہن، زیب النساء، سلیمہ سلطان بیگم، وغیرہ، کہ میجر صاحب ایک ایسا تذکرہ مرتب کرنے والے تھے اور آزاد سے کچھ مواد کے طالب تھے۔ آزاد لکھتے ہیں۔

”سلیمہ سلطان ہمایوں کی پھپی زاد بہن تھی۔ نہایت عالی فہم لطیفہ گو، بذلہ سنج، خوش تقریر، صاحب تدبیر، زیب النسا کی طرح وہ بھی مخفی تخلص کرتی تھی۔ تھی تو اتنی لایق مگر جہاں دیکھا اس کا ایک ہی شعر لکھا دیکھا۔ شعر

کاکلت را من بہ مستی رشتۂ جاں گفتہ ام

مست بودم زین سبب حرف پریشاں گفتہ ام“

ایک خط میں آب حیات کی تعریف پر لکھتے ہیں۔

”جو کچھ آب حیات کے باب میں فرمایا ہے فقط قدر افزائی ہے ورنہ من آنم کہ من دانم“

کسی خط میں اس مشکی گھوڑے کا ذکر ہے جو سائیس لے کر بھاگ گیا تھا

پھر اپنے ایف، اے اور بی، اے کے کورس بنانے پر پکڑے جانے کا ماجرا لکھا ہے۔ ان سے اردو اور فارسی نصاب مرتب کرنے کے باب میں رائے طلب لی گئی ہے اور ادھر ان کی ناگزیر عدیم الفرصتی کا وہ عالم کہ دم لینے کی مہلت نہیں۔ لکھتے ہیں۔

"مشکل یہ ہے کہ طبیعت محنت پسند واقع ہوئی ہے، جی چاہتا ہے ایسا انتخاب ہو کہ طلباء کے لیے اس کا مطالعہ مفید بھی ہو اور باعث دلچسپی بھی۔"

اس خط میں نیرنگ خیال اور آب حیات کو امتحان یونیورسٹی میں داخل کر لیے جانے پر جو اس کی مانگ بڑھ گئی ہے اس کا گلہ ہے۔ ان کتابوں کی اتنی قدر تھی کہ پہلی مرتبہ چھپیں ۱۸۸۳ء میں اور ۲-۲ ہزار جلدیں دیکھتے دیکھتے بک گئیں۔

ایک خط میں دربار اکبری کے لیے اپنی جگر کاوی اور انتہائی محنت کا ذکر کیا ہے، وہ بھی بر سبیل تذکرہ، پھر لکھتے ہیں۔

"آب حیات نے تو مجھے ہلاک کر دیا۔ مجھ سے بیوقوفی ہوئی کہ ۱۰ مہینے کا کام تھا جو ½ ۱ مہینے میں کیا۔"

ایک خط میں میجر صاحب کو لکھا ہے۔

" آبِ حیات اور نیرنگِ خیال سے چھٹکارا ہوا تھا کہ اس سال یونیورسٹی مہربان ہوگئی۔ زبانِ اردو میں طلباء کے داخلہ کا ممتحن مقرر کردیا اور زبان دانی میں اردو اور فارسی کا، ایک عربی کا حصّہ بھی گلے کا ہار ہوگیا۔ ان کے سوالات بنانے ایسا وقت نہیں لیتے مگر کاغذات جو نمبر لگانے کو آئے ہیں وہ چھاتی پر پہاڑ ہیں۔ ۶۱۸ کاغذ اور آج سے صرف ۱۰ دن کی مہلت باقی ہے، مجھے صرف ۱۵۰ روپیہ کا اس میں فائدہ ہوگا، میں خدا گواہ ہے کہ اس پر خاک ڈالتا مگر صرف اس لیے منظور کرلیا کہ اس دفعہ کالج کا معاملہ نازک ہو رہا ہے، رجسٹرار ناراض ہوجائے گا تو لوگ مجھے احمق بنائیں گے اور کہیں گے کہ ڈاکٹر[ا] لائٹنر تو باسباب خاص ناراض ہوگئے اور ان کی ناراضی

[ا] ڈاکٹر لائٹنر (   ) قسطنطنیہ میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم پائی اس کے بعد انگلینڈ اور یورپ کے دوسرے ممالک میں ڈاکٹری کی ڈگری پائی، پنجاب ڈائرکٹر تعلیمات رہے، بعد میں مسلمان ہوگئے اور حیدرآباد دکن کے ایک نواب سے ووکنگ (   ) میں مسجد بنوائی۔ جو اب بھی قائم ہے اور جس میں خواجہ کمال الدین مرحوم نے انگلینڈ میں تبلیغ کا کام شروع کیا۔ (ملاحظہ ہو بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۵ پر)

بے شک تدارک پذیر نہ تھی، انھیں تو نے کیا سمجھ کر ناراض کر دیا۔
ڈاکٹر لائنٹر نے کئی دفعہ ممتحن کیا اور میں نے صاف انکار کر دیا۔
خیر، انشاء اللہ ۱۰ روز میں یہ کام ختم ہو جائے گا، پھر دربار اکبری
ہے اور میں ہوں۔"

اس خط کے خاتمہ پر لکھا ہے۔

"مجھے اکبر کی ایک تصویر ہاتھ آئی کہ ۳۔۴ ترک عورتیں
بیٹھی ہیں اور وہ دو تین برس کا بچّہ بیچ میں کھیلتا پھرتا ہے،
رات کا وقت ہے شمع دان روشن ہے۔ جھنجنے وغیرہ سامنے پڑے ہیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۴) انھوں نے ( ) میں ( ) بھی
قایم کی جس میں اب تک یوروپ کے بڑے بڑے مستشرقین علمی کاموں میں مشغول رہتے
ہیں۔ انھوں نے ( ) سے (
)
نام کا ایک سہ ماہی رسالہ نکالا۔ جو اپنے وقت کا یوروپ میں ایک زبردست علمی رسالہ
مانا جاتا ہے اور اب بھی " " کے
نام سے شائع ہوتا ہے۔

از ڈاکٹر مرزا ابوالفضل ام، اے۔ پی، ایچ، ڈی

یہ اکبر کے ابتدائی حالات میں لگانی واجب ہے، ایک ایسی ہی
پُرانی تصویر اور ملا دوپیازہ کی ملی ہے بیربل کے ساتھ اسے بھی
لگانا چاہیے۔"

ایک خط میں اپنی بوکھلاہٹ اور کس مپرسی کا یوں نقشہ کھینچا ہے،
"برابر خطوط چلے آتے ہیں کہ فرمائیے دربار اکبری کا کیا
حال ہے، قند پارسی کا کیا حال ہے۔ لکچروں کا کیا حال ہے،
یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ آزاد کا کیا حال ہے۔"

پھر اب یہاں سے محمد دین صاحب کے نام خطوط شروع ہو جاتے ہیں۔
مگر ان میں کوئی ایسی خاص بات نہیں، صفحہ ۱۰۵ سے اپنے حبیب لبیب
منشی ذکاء اللہ مرحوم کے نام خط ہیں، جو ان کے محرم راز تھے۔ یہ دو خط
بقول آغا محمد طاہر صاحب فقط مسودہ کر کے بھول گئے ہیں۔ روانہ نہیں
کیے اور نہ یہ اس قابل بھی نہ تھے کہ مکتوبات کے ذیل میں آتے۔ حالت جذب
میں لکھے ہیں۔ جذبات و کیفیات کا بیان عجب مستانہ وار طریقہ پر کیا ہے،
ان میں تاریخ بھی نہیں لکھی، جگہ جگہ عبارت آرائی اور مناظر قدرت کا
لطف ملتا ہے، پھر قلم کا قدم جا بجا ڈگمگا جاتا ہے "منشی من" سے انھیں
مخاطب کیا ہے، اس خط کی ساری عبارت بے ڈھنگی، بے ربط و غیر مسلسل

ہے۔ کچھ کہنا چاہتے ہیں کچھ کہہ جاتے ہیں۔ چہل قدمی کا ذکر، رات کی ٹھنڈی ہواؤں کا بیان تربوز کھانے سے بخار کا ہو جاتا اور جوڑ جوڑ میں درد ہونا، ہواخوری کی حد بابو را جس کی کوٹھی تھی۔ جس کے سو سو پھیرے ہوتے اس میں ہواخوری کا ذکر بڑا دلچسپ ہے۔

"حقیقت میں لطف عجیب حاصل ہوتا جاتا تھا، سینہ ہلکا ہوتا تھا، گھبراہٹ تھم جاتی تھی۔ جوہڑ کے کنارے پر پہنچے تو ہوا کی لہریں پانی سے مباحثے کر رہی تھیں شیشم کا ہرا بھرا درخت اس کی شادابی کا لطف، ٹھنڈی ہوا کی موجیں، حکم ہوا کہ یہاں رات کا سامان کرکے میٹھو دل بھوکا ہے پیٹ بھوکا ہے۔ گھر آکر تقاضائے شفقت سے صرف دہی چاٹ کر اور دیڑھ کباب سے مُنہ سلونا کرکے دسترخوان زیاد کیا۔

پھر کچھ بہکی بہکی باتیں ہیں، خاص الہامی رٹ ہے۔ جیسے کوئی طاقت ان پر حاوی ہے اور وہی لکھوا رہی ہے۔

دوسرے خط میں بھی وہی رنگ ہے، خاصی مجنونانہ باتیں ہیں مثلاً ہوا کھانے حسبِ معمول نکلے ہیں۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ایک مردِ مقدس پرہیزگار صورت، جبّہ پہنے ہیں، حاجیانِ عرب کا عمامہ سر پر، ہزار دانہ کی تسبیح

ہاتھ میں آہستہ آہستہ سڑک پر چلے جاتے ہیں۔ ان کے چہرہ کو سفید ڈاڑھی کے نور نے روشن کیا تھا جبہ کے سبز رنگ سے معلوم ہوتا تھا کہ حضرت خضر ہیں مگر عصا کہتا تھا کہ حضرت موسیٰ بھی ہیں۔ ان کی باتوں اور آنکھوں نے مجھے متاثر کیا۔ میں نے مصافحہ کر کے ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور عرض کی کہ مجھ روسیاہ کو کچھ نصیحت فرمائیں جو میرے کام آئے۔ وہ مسکرائے اور سوال کیا کہ کیا قلم دوات تمھارے پاس ہے۔ میں نے عرض کیا کہ نہیں۔ مگر آپ جو کچھ فرماتے جائیںگے صفحہ دل پر نقش کرتا جاؤں گا، فرمایا سنو، سب سے پہلی بات یہ کہ دنیا میں دوست تو کوئی ہے ہی نہیں۔ جو زیادہ دوستی برتے اسی کو دشمن سمجھنا۔ دشمن سے ایسی دلفریب محبت برتو کہ دوستوں کی دوستی بھی نابود ہو جائے۔ آدمی ہو تو الو بن جائے۔ غرض اسی قسم کی واہیات باتیں کرتے کرتے خط ابھی ختم ہی نہ ہوا کہ ختم ہو گیا۔

اب یہاں سے شاگردوں کے نام خط لکھے ہیں۔ پہلا خط لالہ دونی چند وکیل جگراؤں ضلع لدھیانہ کے نام ہے۔ ۱۹۰۶ء کے لکھے ہوئے خط ہیں ایک خط میں ان سے ایک ملیح شکایت بھی کی ہے

"تم لاہور آئے اور مجھ سے بے ملے چلے گئے، شاباش،
خدا تمھیں ایسا بڑا کرے کہ تجھے پہچان نہ سکوں"

اس میں جا بجا ابرو کی بیماری، ابرو کی طبیعت، چیچک کا نکل آنا لکھا ہے۔ یہ ان کے فرزند محمد ابراہیم ہیں۔

ایک جگہ لالہ صاحب کو لکھتے ہیں۔

"میرے گھر میں گلے کے درد سے بڑی تکلیف ہے میرے بھی گلے میں درد ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ گرمی اور خشکی سے ہے، دودھ ملائی اور مکھن فائدہ کرتا ہے، واہ واہ بیماری بھی کیا مزے کی ہوئی ہے۔"

بعض خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ مولنا کے کئی بچے صغرسنی میں انتقال کر گئے مثلاً

"صاحب کیا کہوں، پتھر کی چھاتی اور لوہے کا کلیجہ کر لو تو جب میرے خط کو پڑھو اور مجھ سے خط و کتابت کرو۔ خلیفہ جی جب پورے تین مہینے کے ہوئے تو انھیں بھی ملا صاحب کے پہلو میں جا کر سلا آیا۔"

یہ سب لاڈ و پیار کے نام تھے، خلیفہ جی، ابرو وغیرہ۔

ناصر نذیر فراق کے نام ۵ خط ہیں۔ ایک خط میں دوسری شادی کرنے پر لکھا ہے کہ

"بی بھی تو چپڑی اور دو دو، بیوی بھی سیدانی، بُرا نہ ماننا اب تمھاری دلی میں ذات وات کا بالکل خیال نہیں کرتے۔ پیسہ کو دیکھتے ہیں۔"

دوسرے دو خط کچھ یوں ہی سے ہیں، ایک میں ان کا رسالہ "سات طلاقنین" پڑھ کر اس کی تعریف کے پل باندھے ہیں کہ

"اس کو پڑھ کر میرے پیٹ میں بل پڑ گئے، خدا کی پناہ کس بلا کی پھوٹڑ اور گیگلی تھیں، میں دیکھتا ہوں، تمھاری نثر تمھاری نظم سے زیادہ مزیدار ہو چلی ہے خدا رکھے دلی کے رہنے والے اور خواجہ میر دردؔ کے نواسے تم سلیس اردو نہ لکھو گے تو اور کون لکھے گا۔ تمہارا یہ رسالہ اس قابل ہے کہ چھپوایا جائے اور لڑکیوں کو پڑھایا جائے، میں نے جابجا اصلاح دے دی ہے۔"

پھر ایک خط میں اپنے ضعف دماغ کی شکایت ہے۔

"دات کو بالکل کچھ پڑھ نہیں سکتا۔ آزاد بڈھا ہو گیا اور صدماتِ زمانہ نے اس کو توڑ دیا، اپنے مسودے بستوں میں بندھے پڑے ہیں دیکھتا ہوں اور ترستا ہوں۔"

پھر شاگردوں کے نام کچھ خط ہیں اور ایک ۹ - ۱۰ صفحے کا خط سرسید کو لکھا ہے، جس میں ان کی علمی خدمات اور سرگرمیوں کی پرجوش الفاظ میں تعریف کی ہے، اپنی خدمات کو جتایا ہے۔ سررشتۂ تعلیم کی ابتدائی کتابوں کی وجہ تصنیف اور ان کی ترتیب میں جو زحمت و تکالیف برداشت کیے تھے ان کا ذکر ہے۔ پھر یوں ہی مختلف دوستوں، شاگردوں کے نام ہوتے ہوئے ڈاکٹر لائٹنر پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور کے نام کوئی ۱۵-۱۶ خط ہیں، جن میں انھیں "بندہ پرور" سے مخاطب کیا ہے، پرنسپل صاحب نے لوگوں کی کہی سنی پر جو انھیں نقصان پہنچایا ہے اس کا شکوہ کیا ہے لکھتے ہیں۔

"اگر آپ دشمنوں کے ہاتھ سے مجھے خاک میں ملوا دیں گے تو مجھے افسوس نہیں۔ کیونکہ میرا فخر تنخواہ، کرسی اور عہدہ پر نہیں ہے۔ میں اسی خاک پر بیٹھا آپ کو دعائیں دوں گا اور درختوں کے پتوں پر وہ باتیں لکھ کر پھینکوں گا کہ جو پڑھے گا وہ افسوس کرے گا، میرے دل پر جتنے زخم لگے ہیں۔ مجھے عزیز ہیں کہ آپ کے لگائے ہوئے ہیں"

ایک خط میں زاید از نصاب تعلیم کے لیے اجازت لی ہے کسی میں

رخصت اتفاقی کی درخواست ہے، یہ خطوط کا ذخیرہ طاہر صاحب نے بڑی محنت و کاوش سے اکٹھا کیا ہے۔

آخر میں انھوں نے وہ خطوط شامل کیے ہیں جو سرسید اور مولنا حالی نے آزاد کے نام لکھے ہیں۔ ایک نوٹ بھی دیا ہے کہ "سرسید کے خط میاں باوا کے نام بہت ہیں۔ مگر افسوس تمام فارسی میں ہیں"۔ تین خط مولنا حالی نے لکھے ہیں۔ ایک خط میں مومن کی نسبت یوں رقم طراز ہیں:۔

"سفیر ہند امرتسر[1] میں جو مومن کا حال چھپا ہے وہ میں نے آج تک نہیں دیکھا، صرف منشی ذکاء اللہ کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ کسی شخص نے ایسا کچھ لکھا ہے۔ مگر دوسرے صاحب جو آپ پر بھی منہ آئے ہیں ان کا مضمون نواب احمد سعید خاں نے جو بہ تقریب رخصت تشریف لائے تھے، اخبار "صبح صادق" میں دکھایا تھا۔ یہ خیال اکثر حمقا کو ہے کہ آپ نے مذہبی تعصب کے سبب مومن کا حال نہیں لکھا، مگر اس سے بڑھ کر کوئی نحیف اور پوچ خیال نہیں ہو سکتا۔ شعر

دریا بوجود خویش موجے دارد   خس پندارد کہ این کشاکش باست او

---

[1] ملاحظہ ہو مکتوبات آزاد صفحہ ۲۴۵

آپ لوگوں کی یاوہ سرائی پر کچھ التفات نہ کیجیے۔ من ضعف قد استہدف، خیال رکھیے اور اپنا کام کیے جائیے۔ نکتہ چینوں کے خوف سے مفید کام بند نہیں کیے جا سکتے، اگر دو نکتہ چین ہیں تو ہزار مداح و ثنا گو بھی تو ہیں۔"

آخر میں دو خط نواب علاء الدین صاحب علائی رئیس لوہارو اور حافظ غلام رسول صاحب ویرآن کے ہیں، اول الذکر ادب کی وہ مایۂ ناز ہستی ہے، جس نے غالب کے دامنِ تربیت میں ہوش سنبھالا۔ دنیائے ادب ان کے نام سے اس لیے ناواقف ہے کہ انھوں نے اپنی کوئی تصنیف نہیں چھوڑی، مگر نظم و نثر میں مرزا غالب کے خلیفہ مانے جاتے تھے، فارسی اور اُردو دونوں زبانوں پر حاوی تھے۔

دوسرے حافظ صاحب ہیں جو ذوق مرحوم کے شاگرد تھے، نابینا تھے مگر روشنی طبع سے حضرت ذوق، غالب، مومن، صہبائی کے معرکے اس طرح بیان کرتے تھے کہ سما باندھ دیتے تھے، اس خط میں جو آزاد کے نام لکھا ہے، غالب پر برسے ہیں اور خوب برسے ہیں۔ مثلاً

بہوں پاس آنکھ قبلہ حاجات چاہیے

"بہوں پاس کیا لفظ ہے اور قبلہ حاجات معشوق کو کہنا کیا ان کے والد تھے"

بس پھر اس کے بعد دو خط ادھر اُدھر کے ہیں، جن کو یوں ہی اس مجموعہ میں شریک کر لیا گیا ہے، خاتمہ پر ان اصحاب کا تھوڑا سا بیان ہے جن کے نام آزاد مرحوم کے خط ہیں اور اس طرح یہ محنت ٹھکانے لگی ہے۔

فلسفہ الہیات[1] ۹۶ صفحات کی ایک تصنیف ہے جس میں اردو زبان میں الہامی طرزِ بیان جلوہ گر ہے، مرحوم نے یہ کتاب عالم خود فراموشی میں لکھی ہے چنانچہ ہر اس شخص کے لیے یہ کتاب ایک نعمت غیر مترقبہ ہے جو دقیق النظر ہونے کے علاوہ نفسیات سے بھی کچھ لگاؤ رکھتا ہے، کیونکہ مولانا نے اس کو کچھ اسی رنگ میں لکھا ہے، گویا یہ تمام عبارت کوئی دوسری قوت لکھوا رہی ہے، وہ خود کچھ نہیں لکھتے۔

اس میں آپ مختلف باتیں دیکھیں گے بعض عقائد کی بحثیں ہیں اور عقلی نظریات جو مختلف زبانوں میں موجود تھیں ان کو مولانا نے آپس میں متوازن کیا ہے۔ کچھ حصہ دعاؤں اور التجاؤں سے معمور ہے، طرزِ تحریر ایک ہی ڈگر پر قائم نہیں، جلد جلد بدلتی ہے۔ ابتداء میں ذرا الجھن ہوتی ہے، لیکن ایک نئی طرز کی اردو ہے جس کو ذرا غور سے پڑھنے کی ضرورت ہے، ابتدائی دو صفحے بالکل مجذوب کی بڑ معلوم ہوتے ہیں، ان کو سمجھنا ذرا دشوار

---

[1] سنہ تصنیف ۱۹۲۶ء

ہے۔ تیسرے صفحہ پر نفس ناطقہ سے مخاطب ہیں اور گویا اس میں یہ ثابت کیا ہے کہ جو کچھ افعال انسان سے ظہور پذیر ہوتے ہیں ان سب کا فرماں روا "ایشور" ہے۔ اس میں انھوں نے خدا کو ایشور لکھا ہے۔

اس کتاب کے جتنے ابواب ہیں وہ باب نہیں کہلاتے بلکہ "ملاپ" سے معنون ہیں۔ مثلاً "فلسفہ الہیات"، ملاپ پر محیط ہے۔

نفس ناطقہ کی تعریف کے بعد پہلا ملاپ ہے۔ اس میں ان چیزوں کا بیان ہے جنہیں ہم دیکھتے ہیں اور وہ ہیں۔ سوچتے ہیں اور پاتے ہیں مثلاً مادہ، صورت، شکل، سرمد، جمال، عقل، وغیرہ۔ اس میں ان سب کی تشریح کی ہے، مگر ان کا سمجھنا ذرا مشکل ہے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور کہنا کیا چاہتے ہیں۔ دوسرے ملاپ میں ابتدا میں لکھا ہے

"یہ باتیں ہیں جن کو ہم نے دیکھا، ہم ہیں تو ہیں یہ باتیں

آہ ہم نہ ہوتے تو نہ ہوتیں۔ کیونکر؟"

ہے تو بڑے پتے کی باتیں لیکن عقل ان گتھیوں کو سلجھانے میں لا پتہ نہ ہو جائے تو معجزہ سمجھیے۔ اس میں عقل، نفس، حکمت، فلسفہ، قدرت، وغیرہ کی تشریح ہے، اس میں جا بجا ایشور لکھا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ بھاشا اور ہندی کا اثر جو ان پر تھا وہ غالب ہے اور حالتِ جذب میں دماغ پر

بہت حاوی ہوگیا ہے، بلکہ کتاب کے آخری صفحہ تک ایشور ہی الاپے جاتے ہیں، خداوند کریم کے واجب الوجود ہونے اور وحدت الوجود کا سرمایہ اس میں بھر دیا ہے۔

تیسرا ملاپ ان چیزوں کے باب میں ہے جو ہم میں ہیں اور معلوم نہیں ہوتیں کہ کیونکر ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ ہیں تو سہی مگر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ہم میں کہاں ہیں۔ اس میں بڑی دلچسپ بحث چھیڑی ہے، مثلاً یہ کہ وہم ہم میں ہے۔ دھیان ہم میں ہے۔ قوت حافظہ ہے۔ مگر نہیں معلوم کہ یہ سب کہاں ہیں کہیں گے کہ دماغ میں ہیں یہ سب مگر وہاں تو نہیں پہلے پہل عقل پر بحث کی ہے اور اس کے بارہ اقسام بنائے ہیں، اس کے بعد حکمت پر خامہ آرائی ہے، اس میں منطقی دلایل و براہین سے گویا غالب کے اس فلسفہ کی تشریح کر دی ہے۔ شعر

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما باندھتے ہیں

صبر، جبر و قہر، موت و حیات، سکوت جبل، وغیرہ پر منطقی و الہامی بحث ہے۔ جس کے نکات سمجھنے سے ہم سطحی نظر والے معذور ہیں۔

چوتھے ملاپ میں ان چیزوں کا بیان ہے جو ہم سے الگ ہیں، اس میں بھی بعض بڑے پتے کی باتیں ہیں۔ مثلاً قسمت پر بحث ہے۔ لکھا ہے "جو ہم سمجھتے ہیں تم نہیں سمجھتے، تم ہماری کی ہوئی قسمت پہ

خاموش کیوں ہوتے ہو، ایک ایک کے آگے زار نالی کرتے ہو،
ہماری دی ہوئی چیز پہ خوش رہنا"۔

اس میں زیادہ تر مجذوبانہ رنگ جلوہ گر ہے، جس کو واقعی سمجھنے سے

ہم قاصر ہمارا دماغ قاصر۔

پانچویں ملاپ میں عالم ناسوت کا بیان ہے اور اس نظریہ پر روشنی
ڈالی ہے۔

"اللہ تعالیٰ انسان کے شہ رگ سے بھی قریب ہے"۔

پھر لکھتے ہیں

"ہم بہت دور ہیں اور اگر تم ہم میں ہو تو ہم سے زیادہ
کوئی پاس نہیں، ہم میں ہو تو ایسے ہو کہ ہم ہی ہوں، دوسرا
خیال نہ ہو"۔

پھر عالم لاہوت کا بیان ہے، دھرم و ایمان کی منطق ہے، تاہم اکثر
باتیں ایسی ہیں کہ ان کا مفہوم یا آپ وہ سمجھ سکتے ہیں یا خدا سمجھے۔

چھٹے ملاپ میں کتاب کے نام کی گویا وجہ تسمیہ ہے، یعنی الٰہیات پر
خیالات بکھیرے ہیں۔ مثلاً یہ کہ

"ہم ہیں اپنے علم میں آپ علم، ہمیں کسی شئے کی احتیاج

نہیں، ہر شے میں ہم موجود ہیں"

یہ الہی باتیں الہی جانے، ہم آپ نہیں جان سکتے۔

ساتویں ملاپ میں ان امور کی رو داد لکھی ہے جو حواس خمسہ سے متعلق ہیں، یہ ملاپ در اصل حواس خمسہ کا ملاپ ہے۔ اس میں بڑی دلچسپ باتیں ہیں۔ جیسے

"ہم جب کسی چیز کو دیکھتے ہیں تو کیونکر دیکھتے ہیں آنکھوں سے، جب ہم اسے سوچتے ہیں تو کیونکر، عقل سے جب شے سمجھ میں آتی ہے تو کیا ہوتی ہے، یہ ہے ہماری مرضی"

غرض یہ اور اسی قسم کے دلچسپ سوال و جواب ہیں، اس کتاب کے آخر میں عبدالمجید صاحب لاہوری کا ایک کتبہ درج ہے، جس کو اس کے متن سے بہت کچھ مناسبت ہے اور وہ یہ ہے :-

خود کو اتنا مٹا کہ تو نہ رہے   تیری ہستی کا رنگ و بو نہ رہے

ہو میں ایسا وصال پیدا کر   کہ بجز ہو کے غیر ہو نہ رہے

رسالۂ سیاک و نماک یہ ۹۱ صفحے کا ایک رسالہ ہے، جس کو جناب مولوی میر ممتاز علی صاحب نے اپنے زیر اہتمام طبع کروایا تھا۔ اس کا سنہ اشاعت معلوم نہیں، پھر شائقین ادب کے پیہم تقاضوں سے آغا محمد طاہر صاحب

نے دوبارہ اپنے زیر اہتمام ۱۹۲۶ء میں چھپوایا۔

یہ بھی مولانا آزاد کے زمانۂ جنون کی تصنیف ہے، الہامی اُردو کا ایک بے مثل نمونہ۔

انھیں تصوف کا درس بچپن سے از بر تھا۔ اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عالی دماغوں کی بیماری بھی دوسرے دماغوں کی بیماری سے مختلف ہوتی ہے۔ یہ کتاب کسی ایسے شخص کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے جس کو کسی نئے مذہب کا بانی ہونا چاہیے۔

دیوان ذوق جس میں ملک الشعرا خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوقؔ کا کلام استاد کے قلمی مسودوں اپنی مختلف بیاضوں اور یادداشتوں سے جمع کیا ہے۔ سوانح عمری شروع کتاب میں ہے اور اکثر غزلیات و قصاید کے متعلق دلچسپ نوٹ مولانا آزاد نے خود لکھے ہیں، ۱۰ ماہ کی لگاتار محنت کے بعد ان اوراق پریشان کو مجتمع کیا ہے جو منتشر حالت میں سرگرداں تھے، ایک بار کوہ نور کے ایڈیٹر سے آزاد نے کہا

"میں نے اس دیوان کو ترتیب دینے میں بڑی محنت کی ہے۔ ۱۰ ماہ دن رات آنکھوں کا تیل ٹپکایا ہے۔ الزام یہ ہے کہ میں خود غزلیں کہہ کر استاد کے نام سے شایع کرتا ہوں

اگر ایسا ہوتا تو خود اپنے نام سے شایع کرتا۔"

ذوقؔ کے دیوان کا سارا سرمایہ غدر کی نذر ہو گیا۔ جس کو آزادؔ اور ذوقؔ کے فرزند خلیفہ اسمٰعیل نے ترتیب دیا تھا۔ تقریباً ۱۸۶۳ء میں ذوقؔ کے ایک شاگرد حافظ غلام رسول ویرانؔ نے اپنے حافظہ اور احباب کی مدد سے ایک مجموعہ تمام غزلوں، متفرق اشعار اور چند قصیدوں کا چھانٹ کر نکالا۔ ذوقؔ کا مختصر دیوان یہی ہے۔

نظمِ آزادؔ | آزادؔ کی چند مثنویاں جو لاہور سکشنا سبھا کے مشاعرہ میں پڑھی گئیں اور دیگر متفرق غزلیات، قصاید، اشعار، رباعیات وغیرہ رسالہ کی صورت میں اکھٹا کیے گئے۔ حسن و عشق کی قید سے آزاد، اخلاقی نظموں کا ایک پاکیزہ مرقع ہے۔ مغربی پھولوں سے مشرقی دامن کو سجایا ہے۔

نصیحت کا کرن پھول | تعلیم نسواں کی نسبت ایک میاں بیوی کی دلچسپ بحث، آسان اردو زبان میں، لڑکیوں کے پڑھنے کے لیے مفید اور مناسب کتاب ہے، جس میں آسان سیدھے سادے فقرے، روزمرہ کی بول چال اور لڑکیوں کی خاص دل بستگی کا سامان ہے۔

اخبار اتالیق پنجاب اور پنجاب میگزین۔ | اخبار اتالیق پنجاب ایک سرکاری اخبار تھا۔ جس کے ایڈیٹر ماسٹر پیارے لال آشوبؔ تھے

خدصاحب پر تو آزاد کی قابلیت کا سکہ بیٹھ ہی گیا تھا۔ جن کی توجہ سے ان کی دن دونی قدر ہونے لگی۔ اس کے بعد کرنل ہالرائیڈ نے انھیں (۷۵) تنخواہ دے کر اتالیق پنجاب کا سب ایڈیٹر بنا دیا، کچھ تو اس وجہ سے کہ اس اخبار کی سالانہ قیمت نسبتاً دوسرے اخبارات سے کم تھی کچھ اس لیے کہ یہ ایک سرکاری اخبار تھا اور زیادہ سے زیادہ اس سبب سے کہ ایڈیٹر و سب ایڈیٹر دونوں قابل یہ اخبار اتنا مقبول خاص و عام ہوا کہ اپنے ہم عصر اخباروں سے بازی لے گیا یوں بھی مضامین کی رنگینی و خوبی، عبارت کی برجستگی اور خوش اسلوبی نے اس کو ہر دل عزیز بنا دیا تھا اسی شاندار ہر دل عزیزی کو دیکھ کر ہندوستانی اخباروں کے دل جذبۂ رشک سے جل اٹھے اور ان سب نے گورنمنٹ سے درخواست کی کہ گورنمنٹ کا رعایا کے مقابلہ میں اخبار شائع کرنا درپردہ ملکی لوگوں کو نقصان پہنچانا ہے۔ گورنمنٹ نے اس معقول عذر کو تسلیم کر لیا، اخبار مذکور کی جگہ ایک رسالہ پنجاب میگزین کے نام سے جاری کر دیا۔ حضرت آزاد کے بعد جب وہ پروفیسر ہو گئے تو خواجہ حالی نے بھی کچھ دنوں اتالیق پنجاب کی سب ایڈیٹری کا کام انجام دیا تھا۔

دراصل یہ سب ایڈیٹری نہ تھی بلکہ یہ دونوں صاحب ان مضامین کی جو انگریزی سے ترجمہ کیے جاتے تھے۔ زبان کی اصلاح و درستی پر مامور تھے۔

آزاد کی شاعری

اگر اس مقولہ میں کچھ صداقت ہے کہ "ہر شاعر موزوں طبع نہیں ہوتا اور ہر موزوں طبع شاعر نہیں ہو سکتا" تو آزاد کی گئی گذری شاعری پر بھی ایمان لانا پڑتا ہے، وہ صرف نثر میں ہی شاعری نہیں کرتے تھے بلکہ وہ خود شاعر بھی تھے۔ اس طرح وہ نظم و نثر دونوں اصناف کلام پر حاوی تھے، انھوں نے آنکھ کھولتے ہی ذوق کو دیکھا اور یقیناً ان کی صحبت میں انھوں نے بیکار وقت نہیں گذارا۔ شاعر کی صحبت اور انسان، پھر شاعرانہ طبیعت کا انسان اور شاعر نہ بنے۔ آزاد خود اپنی واردات شاعری دیوان ذوق کے دیباچہ میں یوں لکھتے ہیں:۔

"استاد[1] ذوق ایک دن بادشاہ کی غزل کہہ رہے تھے، تیر ہمیشہ، تصویر ہمیشہ، سوچتے سوچتے کہنے لگے، تم بھی تو کچھ کہو، میں نے کہا کیا عرض کروں۔ فرمایا، میاں! اسی طرح آتا ہے۔ ہوں ہاں، غوں غاں کچھ تو کہو، کوئی مصرعہ ہی سہی

---

[1] دیوان ذوق صفحہ ۴۳۔

میں نے کہا ع

سینہ سے لگائے تیری تصویر ہمیشہ

ذرا تامل کر کے کہا۔ ہاں درست ہے، شعر

آجائے اگر ہاتھ تو کیا چین سے رہیے سینہ سے لگائے تیری تصویر ہمیشہ"

آزاد کا یہ سب سے پہلا شعر ہے۔

آزاد فطری شاعر تھے اور ازل سے شاعرانہ طبیعت کے مالک تھے جس کی نثر شاعرانہ لطافتوں کی تشبیہ و استعاروں کے ہنگاموں سے مالا مال ہو اس کو شاعر نہ کہنا خود شاعری ہے۔

استاد ذوق سے نوجوان آزاد کو بڑی حسن عقیدت تھی۔ انھیں کے فیض صحبت اور حسن تربیت نے آزاد کے حساس دل میں جذبۂ شاعری کی لہر دوڑا دی، وہ نہ صرف ان کی شاعرانہ صحبتوں سے ہی لطف اندوز ہوئے بلکہ انھیں کی صحبت میں دلی کے بڑے بڑے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے جہاں مشہور اساتذہ فن سے شناسائی کے علاوہ ان کے کلام کے حسن و قبح سے بھی بخوبی مستفید ہو جاتے تھے۔ ذوق کی وفات کے بعد وہ حکیم آغا جان عیش سے اصلاح لینے لگے اور اپنا کلام دلی کے مشاعروں میں سنانے لگے۔ کہتے ہیں کہ ان کا اس زمانہ کا کلام غدر کے نذر ہو گیا۔

"آزاد کا رتبہ اردو شاعری میں وہی ہے جو اسکاٹ کا انگریزی شاعری میں، کسی نئے خیال کے پیدا کرنے والے اور کسی نئی تحریک کے بانی کو دنیا جس وقعت کی نظر سے دیکھ سکتی ہے آزاد بھی اس کے پوری طرح مستحق ہیں۔ قدیم شاعری کی اصلاح کا انھوں نے ہی سب سے پہلے بیڑا اٹھایا اور جدید شاعری کا تخم بویا۔ دنیائے ادب انھیں کی بدولت نیچرل شاعری کے اصل مفہوم سے آشنا ہوئی۔

کیفی دہلوی منشورات میں لکھتے ہیں۔

"اگر امیر خسرو نے اردو کا پہلا شعر موزوں کیا، اگر ولی نے پہلا دیوان اردو نظم کا مرتب کیا، اگر بیجو باورے نے پہلا دھرپد ہندی زبانوں میں باندھا، اگر رودکی نے پہلا شعر فارسی کا کہا تو حضرت آزاد نے پہلی نظم نئی طرز کی موزوں فرمائی۔"

ان کی شاعری جو ان کے نثر کے مقابلہ میں پھیکی معلوم ہوتی ہے اس کا سبب یہی ہے کہ آزاد بہ نسبت نظم کے نثر کی طرف زیادہ مائل تھے، ان کے تخلص کا اثر ان کے کارناموں سے صاف عیاں ہے، وہ نظم کی محدود بندھی بندھائی ردیف قافیہ کی نشست سے آزاد ہو کر نثر کی دنیا میں اپنے بے پناہ تخیل کا سرمایہ منتشر کرنا چاہتے تھے۔ ان کے خیالات نظم کی مسدود بندشوں سے آزاد رہنے پر تلے ہوئے تھے۔ مناظر قدرت کا حسن جیسے کسی ایک کے لیے مخصوص نہیں

رہتا جس طرح قدرت کی فیاضیاں دعوت عام دیتی رہتی ہیں اسی طرح آزاد بھی نثر کی دنیا میں آکر خیالات کی آزادی چاہتے تھے۔ جہاں تک ان کا کلام ہے اس میں یہی ایک فطری حسن کار فرما ہے۔

میر حسن، نظیر اکبرآبادی اور میر انیس کے بعد آزاد اردو کے سب سے بڑے منظر نگار شاعر ہیں، ان کی شاعری فلسفیانہ عمق سے پرے ہٹی ہوئی ہے۔ لیکن لفظی شان و شوکت جیسی کہ آزاد کی شاعری میں ہے، سودا کے بعد کسی شاعر کے کلام میں نہیں مل سکتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ سودا کا اثر ذوق کی شاعری خصوصاً قصیدہ نگاری کے توسط سے آزاد پر بہت بڑا تھا۔ آزاد نثر کی طرح نظم میں بھی حسن لفظی کے پابند ہیں۔ وہ اپنے ماحول سے متاثر ہوکر اپنے خیالات کا اظہار بڑے جمیل طریقے سے کرتے ہیں۔ ان کی بعض مثنویوں میں ایسے کئی ٹکڑے ملتے ہیں جن میں آزاد منظر نگاری کی تہہ تک پہنچ گئے ہیں۔ اس خصوص میں آزاد کی شاعری، اسالیب کے اعتبار سے نظیر اکبرآبادی سے بہت متاثر معلوم ہوتی ہے مگر فرق دونوں میں اتنا ہے کہ نظیر نصب العینیت کی طرف زیادہ مایل ہیں اور آزاد اپنے گرد و پیش سے حقایق کا انتخاب کرتے ہیں۔

ان کی جدید شاعری کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم نیچرل شاعری ہے اور دوسری قسم اپنے اندر وہ غیر معمولی اضطراب و ہیجان رکھتی ہے جو کسی عجائب خانہ میں

پہنچنے کے بعد اس سیاح اور تماشائی سے ظاہر ہوتے ہیں جس کو یقین ہو کہ وقت کم ہے۔ پاؤں میں چلنے پھرنے کی سکت باقی نہیں اور بہت سی چیزیں قابل دید رہی جاتی ہیں۔ اسی دوسری قسم کے اندر ان کا شہ کار "خسرو امن کا دربار" بھی داخل ہے۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے جس کو تسلیم کرنے سے کس کا فرو پس و پیش ہو سکتا ہے کہ آزاد درجۂ دوم کے معمولی شاعر ہیں۔ چنانچہ اسی لیے ان کی ان نظموں میں کامیابی کی جستجو ان شاعرانہ قوتوں سے باہر کرنی چاہیے۔ جو یقیناً ان کی طبعی مناسبت کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتیں۔ مثلاً اسی مثنوی خواب امن میں "خسرو امن کا دربار" انہوں نے اس طرح سنوارا ہے، نیز اس میں یہ بتلایا ہے کہ ہر قسم کی تمدنی ترقیاں کسی ملک میں صرف امن ہی کی صورت میں ہو سکتی ہیں۔

شعر

میں کہ آشوبِ جہاں سے تھا ستم دیدہ بہت	امن کو سمجھا غنیمت دل غم دیدہ بہت
شوق دل لے کے غرض قصر میں آیا مجھ کو	پر عجب عالم نیرنگ دکھایا مجھ کو
خسرو امن تھا واں جلوہ فزائے دربار	دیتی فرحت تھی دل وجان کو ہوائے دربار
صبح دن رات کھڑی سامنے ہنستی تھی وہاں	نور کے ساتھ سدا اوس برستی تھی وہاں

دل میں افکار پریشاں کا نہ تھا نام وہاں
ہاتھ جمعیت خاطر کے تھے سب کام وہاں

صداقت، جوش اور سادگی اصلی معنوں میں شاعری کے اجزائے ترکیبی ہیں، جن سے بہ حیثیت ایک شاعر آزاد کی شاعری بھی مستثنیٰ نہیں۔ یہ مثنوی اردو شاعری میں ایک ممتاز درجہ رکھتی ہے، اس میں استعارے کے پیرایہ میں انہوں نے امن و امان کے فواید بیان کیے ہیں۔ یہ آزاد کا خاص اسلوب تھا۔ ان کے بہترین نثری کارنامہ "نیرنگ خیال" کی طرح "خواب امن" ایک مخصوص کارنامہ ہے، آزاد کا تخیل اس نظم میں بہت ہی بلند ہوگیا ہے، بھرتی کے شعر اس نظم میں بہ نسبت دوسری نظموں کے بہت کم ہیں۔ الفاظ کی نشست، استعاروں کی خوبی اور لطافت کے اعتبار سے یہ نظم آزاد کی مخصوص ذہنیت اور ان کے آرٹ کا منتہا ہے۔ اس طرح کی نظم لکھنا آسان کام نہیں۔ کیونکہ شاعر کو استعارے کے نبھانے میں بڑی دقتوں کا سامنا ہوتا ہے اور جب وہ سرانجام پاتی ہے تو دلچسپیوں کا ایک مرقع بن جاتی ہے۔

"شب قدر" اور "صبح امید" بھی آزاد کی اچھی مثنویاں ہیں لیکن ان میں اول تو آزاد کے اسلوب کی بہت کم خصوصیات موجود ہیں۔ دوسرے جو زور اور صفائی "خواب امن" میں ہے وہ ان میں مفقود ہے۔ "صبح امید" میں نہایت موثر طریقہ سے دکھلایا ہے کہ مختلف کاروبارِ عالم، مثلاً زراعت، تجارت، ملک گیری، تعلیم وغیرہ میں امید ہی کارفرما ہے۔ دنیا امیدوں کی

جولانگاہ ہے اور اسی بنیاد پر قایم رہے گی۔

"مثنوی ابر کرم" میں ہندوستان کے موسم بہار یعنی برسات کا سماں باندھا ہے۔ یہ نظم حالی کی "برکھارت" کے طرز پر ہے۔

"گنج قناعت، وداع انصاف، داد انصاف" میں بھی آزاد نے اسی قسم کے استعاروں سے کام لیا ہے لیکن ان میں وہ چستی و بندش عنقا ہے۔

آزاد کی شاعری اصلاحی پروپگنڈے سے پاک ہے، انھوں نے اپنی شاعری کو اصلاح کا براہ راست ذریعہ نہیں بنایا۔ بلکہ اپنی تقریروں[1] سے انھوں نے یہ کام لیا ہے۔

"وہ[2] چیز جو آزاد کے کلام میں خاص طور پر مابہ الامتیاز ہے وہ یہ ہے کہ ان کی جدید شاعری کا مطمع نظر ہمیشہ ایک رہا۔ ان کی رائے میں حالی، شبلی وغیرہ کی طرح کبھی تذبذب نہیں پیدا ہوا" آزاد کے نقطۂ خیال سے شعر کا جو معیار تھا اس کو انھوں نے اپنی تقریر میں اس طرح ظاہر کیا ہے:۔

"اگر[3] کوئی کلام منظوم تو ہو، لیکن اثر سے خالی ہو تو وہ

---

[1] وہ تقریریں ملاحظہ ہوں جو نظم آزاد کے ساتھ شایع ہوتی ہیں۔

[2] جدید اُردو شاعری (صفحہ ۱۰۸)

[3] "نظم آزاد" نظم اور کلام کے باب میں خیالات۔

ایک ایسا کھانا ہے کہ جس میں کوئی مزا نہیں۔ وہ کھٹا نہ میٹھا جیسا کہ
شعر کسی استاد کا ہے۔ شعر

دنداں تو جملہ در دہانند   چشمان تو زیر ابروانند

نظم درحقیقت ایک شاخ گلریز فصاحت کی ہے جس طرح پھولوں
کے رنگ و بو سے دماغ جسمانی تروتازہ ہو جاتا ہے شعر سے روح ترو
تازہ ہوتی ہے۔ پھولوں کی بو سے مختلف خوشبوئیں محسوس دماغ
ہوتی ہیں۔ کسی کی بو تیز ہوتی ہے۔ کسی کی بو مست ہے۔ کسی بو میں
نفاست و لطافت ہے۔ کسی میں سہانا پن، اسی طرح مضامین
اشعار کا بھی یہی حال ہے۔ جس طرح پھول کہ کبھی چمن میں کبھی
ہار میں، کبھی عطر کھینچ کر، کبھی عرق میں جا کر، کبھی دور سے کبھی
پاس سے اس کی مختلف کیفیتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اسی طرح مضامین
شعری مختلف حالتوں اور مختلف عبارتوں میں رنگا رنگ کی
کیفیتیں عیاں کرتے ہیں۔"

یہی ہے آزاد کی شاعری اور یہی ہے ان کا طریقۂ بیان، اس بلندی
تخیل کے زینہ سے آزاد اپنے شعری نصب العین کی چوٹی پر پہنچ جاتے ہیں۔
اپنی اسی تقریر میں انھوں نے شعر کے ساتھ رفعت خیال اور تاثیر معنوی کو بھی

متعلق کیا ہے۔ یہ آزاد کا میدان نہیں تھا۔ جہاں کہیں بھی انہوں نے بلند پروازی اور فلسفیانہ غور و خوض کی کوشش کی ہے انھیں ناکامی کا سامنا ہوا ہے۔

آزاد کی شاعری مرجھائے ہوئے قلب اور پژمردہ احساسات کے لیے دل بہلائی کے اسباب پیدا کر سکتی ہے۔ "دامن دل سے گرد افکار" کو دھو سکتی ہے۔ لیکن "خیال کو عروج اور ذہن کو قوت پرواز" عطا نہیں کر سکتی شاعر بالعموم دو مصرعوں میں اچھا خاصا افسانہ بیان کر دیتا ہے۔ ایک اچھا شعر دل پر وہ قیامت برپا کرتا ہے، جو دفتر کے دفتر نہیں کر سکتے۔ شاعر احساس انسانی کا واحد ترجمان ہوتا ہے۔ بعض اشعار محض الفاظ کا طلسم ہوتے ہیں، جن میں شگفتگی، رعنائی، لطافت، ترنم اور تشبیہ و استعاروں کی ایک دنیا ہوتی ہے۔ پس آزاد کی شاعری بھی اسی مکتب خیال کی پیرو ہے۔

تصنیف کے آزاد
تصویر کے آزاد

آزاد اس زمانہ میں پیدا ہوئے جب کہ ایک دور کا چراغ گل ہو رہا تھا اور دوسرے دور کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا، نئے رجحانات، نئے ولولے، نئی امنگیں، نئے جذبات دل میں موجزن نئی اسپرٹ ان کے رگ و ریشے میں سرایت کر چکی تھی۔ کتابیں بھی لکھیں تو نئی طرز، نیا اسلوب، نیا انداز بیان، نئی وضع، نئی نئی ترکیبیں ان میں نگینوں کی طرح جڑ دیں، ان کے کلام و بیان کی نازک خیالیاں، لطایف

وظائف کی جدت طرازیاں تشبیہ و استعاروں کے گہنے سے رچی ہوئی زبان، خیالات میں وہ روانی اور سریلا راگ جو پڑھنے والے کو ایک لافانی سکون سے دوچار کر دے۔ الفاظ کی خوبصورت حسین ترکیبوں اور بندشوں میں ابدی زندگی کا احساس ہونے لگے حقیقت میں آزاد نے ادب کی زبان کا ذائقہ ہی بدل دیا۔ ہم ان کو ایک نئی دنیا کا انسان کیونکر نہ سمجھیں۔ ان کی ساری کتابیں جدید طرز کی لکھی ہوئی ہیں جن کو پڑھ کر تخیل پر ایک وجدانی کیف طاری ہو جاتا ہے۔ جیسے بہار کی قوس و قزح میں دل جھولا جھول رہا ہے۔ علم و فضل کا ایک بے پناہ سمندر جس کے عمق کی خبر اس کے الفاظ کی جادو بیانی میں گم ہو جانے کے بعد ملتی ہے تقریر کی دلکشی میں موہ لینے کی وہ بے پناہ قوت جس کو صرف ملنے والوں کا ہی دل جانتا ہے۔ اقلیم ادب کا یہ شہنشاہ جس نے ادب جدید کی روح پر ایک سنسنی خیز کارفرمائی کی۔ سماج کی نبض کو جس نے محسوس کیا۔ جس کے ادبی شہکاروں میں قوم کے دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے جس نے جو کچھ بھی کہہ دیا وہ اب تک ادب و انشا کے ماتھے پر افشاں کا کام کر رہا ہے۔ اسی آزاد کو پڑھ لینے کے بعد جب ہم تصویر کے پردہ پر دیکھتے ہیں تو اس کو ایک مولویانہ طرز کا علامہ سمجھنے لگتے ہیں۔ تخیل کے پس منظر نے جو آزاد کی تصویر بنائی تھی وہ اس آزاد سے کتنی مختلف معلوم ہوتی ہے تصویر دیکھ کر

تعجب ہوتا ہے کہ اسی قدامت پسند وضع قطع کے آزاد نے نیچرل یا نئی شاعری کی نیو ڈالی تھی۔ان کی تصانیف کو دیکھنے کے بعد تخیل ایک ایسی تصویر بنا رہا تھا جس پر نازک خیالیاں ختم تھیں۔مثلاً یہ کہ یہ کس قسم کا انسان ہوگا جس کا ایسا دل و دماغ تھا۔خیالات کی بے پناہ موجیں جو عقد ثریا سے جا ملتی تھیں تصویر دیکھ کر اپنا سا منہ لیے رہ گئیں۔ یہ تصویر تو وہ ہے جو ان کی تصویر کو دیکھے بغیر تصور کی آنکھوں نے پیدا کی تھی۔ ہمارا تخیل ان کی جسمانی ساخت سے بالکل ایک علیحدہ ڈھانچہ تیار کر چکا تھا۔ان کے چوڑے چکلے ہاڑ بڑے بڑے ہاتھ پاؤں دیکھ کر ان کی وسعت بیان کا اندازہ لگ جاتا تھا مگر مزاج کی رنگینی اور زور بیان کی شگفتگی کسی پہلو سے نمایاں نہ ہوتی تھی۔ وضع و قطع سب مولویانہ وہی مولویوں کا سا صافہ، ریش مقطع و تراشیدہ۔ لباس میں وضع داری، لٹھے کا ڈھیلا ڈھالا چغہ۔غرض ایک بنے بنائے مولوی تصویر میں بڑے رعب و متانت سے کھڑے ہیں۔

آزاد کا پیرایۂ تنقید

اسلامی لٹریچر میں شاید کوئی شاعر یا ادیب ایسا گذرا ہوگا جس کی تصنیفات پر موافق حال حق بجانب تنقید کی گئی ہو۔ یہ مانا کہ تنقید ہی اصلاح کا ایک تیر بہدف پیرایہ ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ فی زمانا ہمارے نظریات بدلتے جائیں۔ ہم آرٹ اور حسن کو اپنی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کریں۔ آزاد کی دیوانگی تک اگر ہم اس کے معیار کو جانچنے لگیں تو دنیا پچاس برس دور نکل آئی ہے، جو نظریات ان لوگوں نے بنائے تھے انشا اور ادب کا اس گئے گذرے زمانہ میں جو رنگ ڈھنگ تھا اس پر موجودہ دور نے اپنی ممکنہ حد تک رنگ و روغن چڑھا لیا ہے۔ زبان کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس کو کھینچ کھینچ کر آسمان و زمین کے قلابے ملائے گئے ہیں۔ اس کا یہی تو امکان ہے کہ آج جس انشا پردازی کو ہم تصنع و بناوٹ سے معنون کرتے ہیں کل ہمارے ادب پر، ہماری زبان پر بھی خشکی، غیر دلچسپی و بے کیفی کا فتویٰ لگ جائے۔ اگر ہم عہد گذشتہ کی تصانیف پر

اپنی نظریات کی روشنی میں تنقید کرینگے تو ہم کبھی بھی کوئی معقول نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے۔ ہمارا یہ طرزِ عمل ناانصافی پر مبنی ہوگا۔

شیکسپیر کے متعلق اب تک یہ بدگمانی ہے کہ شیکسپیر بالکل جاہل تھا وہ محض ایک اداکار تھا اور بس۔ اس کے جتنے کارنامے ہیں وہ سب اس کے دوست بیکن کی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ مگر یہ سب خیالات ہی خیالات ہیں۔ ان کو دنیائے ادب اب تک تحقیقی طور پر ثابت کرنے سے قاصر ہے۔

یہ ہماری ستم ظریفی نہیں تو کیا ہے کہ جب ہم کسی کے مخصوص طرز کی نقل نہیں کر سکتے تو اس کو غیر سنجیدہ بے تحقیق کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں۔ اس میں اس طرز کی خرابی نہیں ہے بلکہ یہ ہماری عدم قابلیت کا ثبوت ہے اور اپنی بیچارگی کا اعتراف، بقول حفیظ نعیمی

"مولانا شبلی جن کے متعلق خود ان کا مداح یہ لکھے کہ "وہ معاصرانہ کمالات کے اعتراف میں فیاض نہیں تھے"، وہی شبلی جس کے کمالات کا نہایت دریا دلی کے ساتھ اعتراف کریں تو اس کے کمال میں کس کافر کو شبہ ہوسکتا ہے"۔

ایک دوسری جگہ شبلی نے آزاد کی ساحرانہ انشاپردازی کا ایک اور انداز سے اعتراف کیا ہے۔ مہدی الافادی کو خط میں لکھتے ہیں :-

"آزاد کی کتاب آئی۔ جانتا تھا کہ وہ تحقیق کے میدان کا مرد نہیں۔ تاہم ادِھر اُدھر کی گپیں بھی ہانک دیتا تو وحی معلوم ہوتیں"

حیران ہوں کہ جس کو شبلی "تحقیق کے میدان کا مرد نہیں" لکھتے ہیں اسی کے مرثیے میں مولانا حالی اسی کی نسبت یہ فرماتے ہیں۔ شعر

ملکوں میں پھرا مدتوں تحقیق کی خاطر	چھوڑا نہ دقیقہ بھی کوئی رنج و تعب کا
دیکھا نہ سنا ایسا کہیں اہل قلم میں	تصنیف کا، تدوین کا، تحقیق کا لپکا

یہ عجیب دنیا ہے، یہاں جو بلا تحقیق دوسروں کے خیالات پر اپنے خیالات کے حاشیے چڑھاتا ہے اس کے بیان میں ضرور تحقیق پائی جاتی ہے اور جو خود تحقیق میں سرگرم رہکر اپنی کاوشوں سے کوئی نئی بات پیدا کرتا ہے۔ جس میں کچھ نہ کچھ فرق ہوتا ہے، جس کی باتوں میں بلا شبہ انوکھاپن اور جدت ہوتی ہے۔ وہ آنکھوں میں کھٹکنے لگتی ہے اور دوستوں کو اعتراض کرنے کے لیے کافی میدان ملتا ہے، غرض کہنے کو مخالف اور موافق بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن جو انصاف پسند طبیعتیں ہیں وہ مہدی الافادی کے اس منصفانہ فیصلہ کی ضرور تائید کریں گی۔

"آزاد کی ادبی فتوحات تاریخ لٹریچر کا ایک واقعہ ہے جس کا فیصلہ خود فلسفۂ ادب کے ہاتھوں ہوگا اور پروفیسر آزاد کا درجہ بہ حیثیت ادیب جو کچھ ہے اس کا سمجھنا دوم درجہ کی خلقت

اپنی نظریات کی روشنی میں تنقید کرینگے تو ہم کبھی بھی کوئی معقول نتیجہ اخذ نہیں کرسکتے۔ ہمارا یہ طرزِ عمل ناانصافی پر مبنی ہوگا۔

شیکسپیر کے متعلق اب تک یہ بدگمانی ہے کہ شیکسپیر بالکل جاہل تھا وہ محض ایک اداکار تھا اور بس۔ اس کے جتنے کارنامے ہیں وہ سب اس کے دوست بیکن کی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ مگر یہ سب خیالات ہی خیالات ہیں۔ ان کو دنیائے ادب اب تک تحقیقی طور پر ثابت کرنے سے قاصر ہے۔

یہ ہماری ستم ظریفی نہیں تو کیا ہے کہ جب ہم کسی کے مخصوص طرز کی نقل نہیں کرسکتے تو اس کو غیر سنجیدہ بے تحقیق کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں۔ اس میں اس طرز کی خرابی نہیں ہے بلکہ یہ ہماری عدم قابلیت کا ثبوت ہے اور اپنی بیچارگی کا اعتراف، بقول حفیظ نعیمی

"مولٰنا شبلی جن کے متعلق خود ان کا مداح یہ لکھے کہ" وہ معاصرانہ کمالات کے اعتراف میں فیاض نہیں تھے" وہی شبلی جس کے کمالات کا نہایت دریا دلی کے ساتھ اعتراف کریں تو اس کے کمال میں کس کافر کو شبہ ہوسکتا ہے"

ایک دوسری جگہ شبلی نے آزاد کی ساحرانہ انشاپردازی کا ایک اور انداز سے اعتراف کیا ہے۔ مہدی الافادی کو خط میں لکھتے ہیں :-

"آزاد کی کتاب آئی۔ جانتا تھا کہ وہ تحقیق کے میدان کا مرد نہیں۔ تاہم اِدھر اُدھر کی کہیں بھی ہانک دیتا تو وحی معلوم ہوتی"

حیران ہوں کہ جس کو شبلی "تحقیق کے میدان کا مرد نہیں" لکھتے ہیں اسی کے مرثیے مولانا حالی اسی کی نسبت یہ فرماتے ہیں۔ شعر

ملکوں میں پھرا مدتوں تحقیق کی خاطر — چھوڑا نہ دقیقہ بھی کوئی رنج و تعب کا

دیکھا نہ سنا ایسا کہیں اہل قلم میں — تصنیف کا، تدوین کا، تحقیق کا لیکا

یہ عجیب دنیا ہے، یہاں جو بلا تحقیق دوسروں کے خیالات پر اپنے خیالات کے حاشیے چڑھاتا ہے اس کے بیان میں ضرور تحقیق پائی جاتی ہے اور جو خود تحقیق میں سرگرم رہکر اپنی کاوشوں سے کوئی نئی بات پیدا کرتا ہے۔ جس میں کچھ نہ کچھ فرق ہوتا ہے، جس کی باتوں میں بلا شبہ انوکھا پن اور جدت ہوتی ہے۔ وہ آنکھوں میں کھٹکنے لگتی ہے اور دوستوں کو اعتراض کرنے کے لیے کافی میدان ملتا ہے، غرض کہنے کو مخالف اور موافق بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن جو انصاف پسند طبیعتیں ہیں وہ مہدی الافادی کے اس منصفانہ فیصلہ کی ضرور تائید کرینگی۔

"آزاد کی ادبی فتوحات تاریخ لٹریچر کا ایک واقعہ ہے جس کا فیصلہ خود فلسفۂ ادب کے ہاتھوں ہوگا اور پروفیسر آزاد کا درجہ بہ حیثیت ادیب جو کچھ ہے اس کا سمجھنا دوم درجہ کی خلقت

کے لیے جو فلسفہ لٹریچر سے قطعاً بیگانہ ہے آسان نہیں ہے۔"

یہ ثابت ہو چکا کہ آزاد زبان اردو کے مسلم الثبوت استاد ہیں۔ مولانا حالی ان کا کلمہ پڑھتے رہے، مولانا شبلی نے "خدائے سخن" کہہ کر پکارا، نذیر احمد ذکاء اللہ وغیرہ نے ان کی زبان کی خوبیوں کو بارہا سراہا، وہ اپنے وقت کے ایک عدیم المثال نثار، جادو بیان انشا پرداز ہی نہیں بلکہ ایک زبردست نقاد بھی سمجھے جاتے تھے اور ایک عرصے تک اس میدان کے وہ تنہا شہسوار تھے لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا ان کی ناقدانہ حیثیت میں فرق آتا گیا۔ یہاں تک کہ لوگوں نے کھلم کھلا انھیں مورخ یا نقاد کہنے سے انکار کر دیا۔ ہاں ان کے سحر کار قلم کا طلسم ہوشربا باقی ہے۔ وہ کسی سے نہ ٹوٹ سکا، نہ ٹوٹ سکتا ہے، نہ ٹوٹے گا۔ چنانچہ شعر الہند اور گلِ رعنا کے مصنف باوجود انھیں ایک غلط بیان مورخ سمجھنے کے لکھتے ہیں کہ جو واقعات آزاد نے بیان کر دیے ہیں اگر ہم ان کے خلاف سندیں بھی پیش کریں تو کوئی یقین نہیں کر سکتا۔ رام بابو سکسینہ آب حیات کی تنقید کی نسبت لکھتے ہیں۔

"افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مولانا نے اپنے جوش و شوق میں تاریخی مواد کو غور و خوض سے نہیں دیکھا۔ غیر موثق اور غیر معتبر حوالوں کی بنیاد پر سر بفلک عمارتیں کھڑی کر دی ہیں اور بعض جگہ دلچسپی

پیدا کرنے کے لیے واقعات میں کمی بیشی اور تبدیلی تک کو جایز رکھا ہے، اکثر جگہ جانب داری کا الزام بھی مصنف پر عاید ہوتا ہے۔"

آزاد کے متعلق نواب صدر یار جنگ بہادر ارقام فرماتے ہیں :۔

"یہ امر میرے نزدیک مسلم ہے کہ بیان واقعات میں سخت بے احتیاط ہیں، بلکہ ضرورت کے وقت واقعات تراشتے ہیں اور اپنی دل فریب طرز سے دل نشین کر دیتے ہیں۔ جس قدر لٹریچر شایع ہوتا جاتا ہے ان کا یہ پہلو سامنے آ آ کر نمایاں اور آشکارا ہوتا جاتا ہے۔ مثلاً میر کے متعلق اور ان کے تذکرے کے متعلق آب حیات کا بیان پڑھو، پھر تذکرۂ میر دیکھو۔ جو شائع ہو چکا ہے، انسان وقف حیرت ہو جاتا ہے۔"

صاحب سیر المصنفین آزاد کو مکالے کا ہم پایہ قرار دیتے ہیں کیونکہ ان کا خیال ہے کہ وہ جذبات کی رو میں بہہ جاتے ہیں اور سکسینہ کا خیال ہے کہ تعصب کی عینک چڑھ جاتی ہے تو ذوق جیسے شاعر کو خدائے سخن غالب سے مقابلہ پر ہی نہیں لے آتے بلکہ بڑھا دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ آزاد نے غالب کو گھٹایا، حالانکہ ذوق اور غالب کا مرتبہ صاحبان ذوق، سلیم سے پوشیدہ نہیں۔ شرر نے بھی اعتراض کیا ہے کہ آزاد نے اکثر صاحبان کمال کا ذکر

آبِ حیات میں نہیں کیا۔ لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ ان کے حالات نہ مل سکتے ہوں۔ کیونکہ سوائے چند قدیم تذکروں کے جو برائے نام تذکرے تھے، آزاد کے پاس کوئی اور معلومات کا ماخذ نہ تھا، یا تھیں تو محض سنی سنائی باتیں، اب مثلاً ذکرِ مومن کی فروگذاشت پر نواب صدر یار جنگ بہادر کیا خوب تحریر فرماتے ہیں۔

"آخر انیس و دبیر کا ذکر بھی پہلی ایڈیشن میں نہ تھا۔ دوسرے ایڈیشن میں مومن، انیس اور دبیر سب ہی آگئے۔"

آزاد نے جو کچھ بھی لکھا اپنی حد تک بعد تلاش و تحقیق کے لکھا، سائنٹفک طریقہ پر کسی واقعہ کو ثابت کرنا ایک ادیب یا شاعر کا فریضہ بھی تو نہیں ہے۔

تاہم انھوں نے ادب کی بہت ساری خدمات اور بھی تو انجام دی ہیں، مثلاً ان کے ایران کے دو سفر، ان کی زبان و محاورہ کی تحقیق جس پر یہ دل چسپ روایت دھرانے طبیعت چاہتی ہے :۔

تقریباً ۱۸۸۰ء میں وہ کتاب خانہ آزاد کی عمارت تعمیر کروا رہے تھے۔ ایک کمرہ بن چکا تھا اور فرطِ اشتیاق سے اس میں چند الماریوں کی ترتیب اور خانہ پری میں مصروف تھے۔ اتفاق سے محاورہ کی صحت استعمال کا ذکر چھڑ گیا۔ فرمانے لگے کہ ایک غیر زبان کے محاورہ کو صحیح اور باموقع استعمال کرنا بہت مشکل ہے اور یہ دل چسپ روایت بیان کی :۔

"ایک دن میں ایران کے ایک صاحب خانہ کا مہمان تھا،
کھانا پک رہا تھا۔ ماں دس بارہ برس کی لڑکی کو چولھے کے پاس
چھوڑ کر آپ اندر کے دالان میں کوئی کام کرنے لگی اور لڑکی سے
کہتی گئی کہ دیگچی کا خیال رکھے، تاکہ کھانا جوش کھا کر ابل نہ پڑے
رفتہ رفتہ آنچ تیز ہوتی گئی۔ اب میں نے سوچا کہ چاول ابل کر
نکل پڑیں گے، دیکھوں تو اس کیفیت کو یہ لڑکی کن الفاظ میں
ظاہر کرتی ہے۔ اس خیالی کیفیت کے مختلف اظہار گھڑتا تھا کہ
شاید یہ کہے گی، یہ کہے گی کہ وہ وقت آپہنچا اور میرے تمام خیالی دفتر
خیالی پلاؤ ثابت ہوئے۔ جوں ہی دیگچی میں چاول جوش کھانے سے
اس کا ڈھکنا ایک طرف سے ایک آدھ انچ اوپر کو اٹھا کہ لڑکی
چیخی۔ اماں دیگچہ سرکردہ۔ یہ لفظ گویا میرے کانوں میں
الہامی کلمہ کی طرح پڑے اور میری آنکھیں کھل گئیں ۔"

جس شخص کو زباندانی کا یہاں تک مذاق ہو۔ جو اس قدر نکتہ رس اور
صاحبِ تلاش ہو۔ جس نے غیر زبان کی تحقیق میں اس درجہ کاوش اور
کوشش کی ہو وہ خود اپنی زبان میں کیا کچھ نہ کر دکھاتا اور حق امر یہ ہے کہ
اردو میں آزاد نے وہ کچھ کر دکھایا جس کی ان جیسے شخص سے توقع کی جا سکتی تھی

کے نگینوں سے ایسا جڑ دیا ہے کہ اس میں ترمیم کرنا قل ہو اللہ کا جواب کہنا ہے
مثلاً میر تقی میرؔ کے لیے لکھا ہے۔

"غزلوں کے دیوان اگرچہ رطب و یابس سے بھرے ہوئے
ہیں۔ مگر جو ان میں انتخاب ہیں وہ فصاحت کے عالم میں انتخاب ہیں"

یا پھر میرؔ کو لکھنؤ کے ایک نواب نے اپنے گھر لے جا کر رکھا کہ ان کی دل بستگی ہو۔ ان کے
لیے ایک ایسا کمرہ تجویز کیا جس کے دریچے ایک خوشنما باغ میں کھلتے تھے۔ لیکن
میر صاحب کہ بے نیازی و خود فراموشی میں اپنا جواب تھے، جن کے لیے باغ اور
ویرانہ دونوں ایک ہی مفہوم رکھتے تھے۔ انھیں برسوں خبر نہ ہوئی کہ جہاں وہ
لائے گئے ہیں وہاں ایک باغ بھی ہے۔ در اصل وہ اپنے باغ سخن کی سیر میں
محو و سرگرداں تھے۔ ان کی اس سرخوشی پر آزادؔ لکھتے ہیں۔

"کیا محویت ہے کئی برس گذر جائیں۔ پہلو میں باغ ہو اور
کھڑکی تک نہ کھولیں، خیر۔ ثمرہ اس کا یہ ہوا کہ انھوں نے دنیا
کے باغ کی طرف نہ دیکھا۔ خدا نے ان کے کلام کو وہ بہار دی کہ
سالہا سال گذر گئے۔ آج تک لوگ ورقے الٹتے ہیں اور گلزار سے
زیادہ خوش ہوتے ہیں"

اس پیرایہ تنقید پر کیا کوئی حاشیہ چڑھا سکتا ہے۔ یہ آزاد کے زبان کا منتر ہے جو

من کو موہ لیتا ہے ۔ انشا کے غزلوں کے دیوان دیکھ کر خیالات کی ہنگامہ خیزی دیکھیے۔

"عجب طلسمات کا عالم ہے ۔ زبان پر قدرت کامل، بیان کا لطف، محاوروں کی نمکینی، ترکیبوں کی خوشنما تراشیں دیکھنے کے قابل ہیں ۔ مگر ابھی کچھ ہیں، ابھی کچھ ہیں ۔ غزلوں میں غزلیت کے اصول کی پابندی نہیں ۔ سبب یہ ہے کہ وہ سخن آفریں ایک ذخیرہ وافر مضامین والفاظ کا اپنے پاس رکھتا تھا ۔ اس سے جس قسم کی مخلوق چاہتا تھا پیدا کر لیتا تھا۔"

سوداؔ کے باب میں آب حیات کے ۲۱ صفحے بھر دیے ہیں ۔ ان اوراق کو تنقید، توصیف لطائف وظرائف سے مرصع ومزین کیا ہے ۔ عام رائے کلام ونثر اردو پر دیکھیے، چھوٹے چھوٹے جملوں میں کتنی بجلیاں بھری ہیں ۔

"ان کا کلام کہتا ہے کہ دل کا کنول ہر وقت کھلا رہتا تھا ۔ اس پر سب رنگوں میں ہم رنگ ۔ اور ہر رنگ میں اپنی ترنگ، طبیعت شورش وجوش سے بھری ہوئی، نظم میں تو سب کو معلوم ہے کبھی دودھ ہے تو کبھی شربت، مگر نثر میں بڑی مشکل ہوتی ہے ۔ فقط مصری کی ڈلیاں چبانی پڑتی ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ نثر اردو ابھی بچہ ہے ۔ زبان نہیں کھلی ۔ چنانچہ شعلۂ عشق کی عبارت

سے واضح ہے کہ اُردو ہے مگر مرزا بیدل کی نثر فارسی معلوم ہوتی ہے"

آزاد نے پُرانی شاعری پر قلم فرسائی کی اور یہ خود بھی پُرانی تنقید کے معتاد تھے۔ مگر اس کے باوجود انھوں نے اپنی تنقیدات کو ایک ایسے مقام پر پہنچایا ہے جو اپنی تیور کے اعتماد سے تمام تر جدید وضع و اسلوب کا سرمایہ معلوم ہوتا ہے، محض زبان پر جب تنقید کرتے ہیں تو اس قدر جامع اور مانع۔ پھر جب کلام کے مضامین پر نظر ڈالتے ہیں تو پورا کلام ان کے قلم کے آگے لرزنے لگتا ہے۔

لوگ جب ذوقیات کی رُو سے شعر کو پسند کرتے ہیں تو بجائے اس کے کہ ہر پہلو پر ان کی نظر ہوتی، کلام کی ایک آدھ بات کو اخذ کر کے کبھی اس کا نام نشتر و خنجر رکھ دیتے ہیں کبھی کسی شعر کو آہ سے تعبیر کرتے ہیں کبھی واہ سے معنون کرتے ہیں۔ اور زمانہ قدیم میں تنقید کا پیرایہ ہی یہ تھا۔ میر کے کلام کے لیے آہ اور سودا کے لیے واہ تو ضرب المثل بن گئی۔ غالب نے بھی میر کے شعر کے لیے کہا ہے کہ

"نشتر کی طرح چبھتا ہے"

ناسخ کے بڑے بول کا سر اس طرح نیچا کیا ہے۔ شعر

سرمہ منظور نظر ٹھہرا جو چشم یار میں نیلگوں گنڈا پہنایا مردم بیمار میں

آزاد کی سمجھ میں نہیں آتا کہ بیمار میں گنڈا کیونکر پہناتے ہیں، گنڈا بیمار کو پہناتے ہیں۔

اب لیجیے غالب کو۔ غالب کے کلام کی دھوم دھام تمام ربع مسکون میں مچی

ہوئی ہے لوگ اس کے کلام کی طرح طرح سے داد دیتے ہیں۔ ایک ایک شعر پر سر دھنتے ہیں۔ دیوان برلن میں تک شائع ہوا ہے۔ ایک برلن کیا، دیوان غالبؔ کے جتنے ایڈیشن نکلے شاید ہی کسی اور کو یہ بات نصیب ہوئی ہے۔ ہمارے استادِ تنقید یعنی آزادؔ بھی اس کے کلام پر رائے زنی کرتے ہیں تو فرماتے ہیں۔

"جس قدر عالم میں مرزا کا نام بلند ہے اس سے ہزاروں درجہ عالم معنیٰ میں کلام بلند ہے، بلکہ اکثر شعر ایسے اعلیٰ درجۂ رفعت پر واقع ہوئے ہیں کہ ہمارے نارسا ذہن وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔"

"شہرت عام و بقائے دوام کے دربار" میں غالب کی ہستی کا اصل معمہ حل کر دیا ہے "ساری عمر لوگ غالب کو لکھتے رہیں گے مگر ایسے خیالات جمع نہیں کر سکتے۔" یہ وہ فقرے ہیں جو صرف آزادؔ ہی کی ملک ہو کر رہ گئے۔

"غالبؔ اگرچہ سب سے پیچھے تھے، پر کسی سے نیچے نہ تھے۔ بڑی دھوم دھام سے آئے اور ایک نقارہ اس زور سے بجایا کہ سب کے کان گنگ کر دیے۔ کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا مگر سب واہ، واہ، سبحان اللہ کرتے رہ گئے۔"

کچھ ٹھکانہ ہے اس تنقید کا۔ دو ایک جملوں میں غالبؔ کو اتنا سمجھا گئے کہ ایک دفتر بھی اتنا نہ کر سکتا۔

آزادؔ کی آبِ حیات کے بعد جو مشہور تذکرہ مطبع کے حوالہ ہوا وہ گلِ رعنا ہے۔

جس کو بہت خوب لکھا ہے۔ لیکن آب حیات سے اپنی تشنگی ضرور بجھائی ہے۔ گل رعنا پر آب حیات کا بہت اثر پڑا ہے۔ آزاد نے جو شرارے پیدا کیے ہیں ان میں سے گل رعنا نے اپنے چراغ روشن کیے ہیں۔ اس کی رعنائی میں بہت بڑا حصّہ آب حیات کا ہے۔ مثلاً حاتم کے ذکر میں آزاد ہی کا ذکر خیر آیا ہے "صاحبزادہ بھی پانچ ہزار سے زیادہ کا مال بغل میں دبائے بیٹھا ہے" یا مظہر جان جاناں کے لیے بھی آب حیات سے ساغر بھرا ہے۔ یا پھر انشا کے بیان میں آب حیات سے خوشہ چینی کر کے بیان میں رعنائی پیدا کی ہے۔ غرض انھوں نے ان کے جملے کے جملے لیے ہیں تنقید کرنا چاہتے ہیں مگر کر نہیں سکتے۔ تنقید کے ہتیار ڈال کر آزاد کو بجنسہٖ نقل کر دیتے ہیں۔ سکسینہ تمام تذکروں کا نچوڑ اور مجموعہ ہے۔ یا یوں کہیے کہ ایک معجون مرکب۔ اکثر وہی باتیں ترجمہ کی ہیں جو آزاد کے ہاں موجود ہیں۔ پس اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ انگریزی میں ہے اور جن سے اس نے اپنی دکان سجائی ہے وہ سب اردو میں۔ ڈاکٹر گراہام بیلی کا تذکرہ اس کا خلاصہ ہے۔

اب رہا آزاد پر غلط بیانی کا الزام، اس کے متعلق آب حیات کا دیباچہ دیکھنے سے تشفی ہو جاتی ہے کہ آزاد نے کہاں سے خیالات کا انبار لگایا اور کیسی تحقیق کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آزاد نے غلط واقعات لکھ دیے ہیں اور قدرتی بات بھی تھی۔ اس سے زیادہ ان کا بس ہی کیا چل سکتا تھا۔ انھوں نے

یہ تذکرہ اور تذکروں کی مدد، نیز ان حالات سے جو بزرگوں سے سنے تھے لکھا ہے۔ انھوں نے کتاب کے دوران میں اپنے ماخذ کا حوالہ بھی درج نہیں کیا۔ ایک مقام پر اپنے نوٹ میں حکیم قدرت اللہ کا حوالہ دیا ہے اور ایک مقام پر مظہر کے بیان میں معمولاتِ مظہری کا ذکر کیا ہے، جو چیزیں کہ انھوں نے اور تذکروں میں دیکھ کر لکھیں اس کے یہ ذمہ دار تو نہیں ہیں۔ جیسے لوگ لکھتے آئے ہیں ویسے ہی انھوں نے لکھ دیے ہیں۔

دوسرا پہلو سنے سنائے واقعات کا ہے۔ ہمارا لٹریچر اس قدر پراگندہ اور منتشر ہے کہ آزاد کے زمانے میں تو خیر آج تک کسی بڑے سے بڑے کتب خانہ میں لٹریچر کے کسی شعبہ کی تکمیل کے لیے پورا تو کیا قدر قلیل بھی سرمایہ میسر نہیں آسکتا۔ یوں بھی دیکھا جائے تو لٹریچر شائع نہیں ہوا۔ قلمی نسخوں کی شکل میں موجود ہے۔ کسی چیز کا کوئی ٹکڑا کسی رسالہ میں شایع ہوجاتا ہے کسی کا کوئی حصّہ کسی کتاب میں سے مل جاتا ہے۔ آبِ حیات کے ۵۰، ۶۰ سال بعد اردو کے کسی پہلو پر کوئی محققانہ کام سلیقہ کا نہیں ہوسکتا تو آزاد کے زمانہ میں کیا توقع ہوسکتی تھی۔ تاہم واقعات کی جانچ کا راستہ سب سے پہلے عالی جناب نواب صدر یار جنگ بہادر نے کھولا اور دوسرے ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش ہی کرتے رہ گئے۔ پھر بھی گویا تحقیقات کے آسمان کا دروازہ کھل گیا ہے۔

آزاد کا درجہ اُردو ادب میں

(۴)

ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں کہ ہم اس موضوع کی ابتدا نواب صدر یار جنگ بہادر جیسے مشہور ادیب اور ادب نواز کے اس فقرے سے کریں۔ صاحب معزز ارقام فرماتے ہیں۔

"اُردو میں انشا پرداز اب تک ان سے بہتر نہیں ہوا۔ انھیں کی نثر اُردو میں ایسی ہے کہ جتنی بار پڑھی جائے لطف ادب حاصل ہو۔"

کیا درست فرمایا ہے آزاد اُردو نثاروں میں ایک نمایاں اور ممتاز حیثیت رکھتے ہیں اور ایک خاص طرز تحریر کے مالک ہیں۔ جس طرح خطوط نویسی میں باوجود کوشش کے غالب کی ہم سری محال ہے اسی طرح آزاد کا طرز بھی انوکھا اور ناقابلِ تقلید ہے۔ انھیں زبان پر وہ قدرت حاصل تھی، جو خاص اہل زبان بلکہ ان سے بھی بڑے زبان دان کا حصّہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کا اندازِ بیان بے حد دل نشیں اور موثر ہے۔ ان کی زبان میں کچھ ایسی خوبیاں ہیں جن سے دل لطف اٹھا سکتا ہے مگر انھیں قلم بند نہیں کیا جا سکتا۔ شاید آزاد ہی کے لیے کسی نے کہا تھا۔

کسی کی آنکھ میں جادو تیری زباں میں ہے

آزاد کا شمار اُردو زبان کے ان نامور انشا پردازوں میں کیا جاتا ہے جن پر اُردو ادب اب تک نازاں ہے جن کا ذکر حفیظ نعیمی نے رسالہ ساقی مارچ نمبر ۱۹۳۵ء میں "اُردو کے عناصر خمسہ" کے عنوان سے کیا ہے۔ وہ اپنے مضمون کی ابتدا مہدی الافادی کے اس شاعرانہ بلیغ جملے سے کرتے ہیں "سرسید سے معقولات الگ کر لیجیے تو کچھ نہیں رہتے۔ نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے۔ شبلی سے تاریخ لے لیجیے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے۔ حالی بھی جہاں تک نثر کا تعلق ہے سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں۔ لیکن آقائے اُردو پروفیسر آزاد صرف انشا پرداز ہیں جن کو اور سہارے کی ضرورت نہیں۔" اگر سچ پوچھیے تو اُردو ادب کی ترکیب اصلی، انھیں پانچ عناصر یعنی آزاد، حالی، نذیر احمد، سرسید اور شبلی سے ہوئی ہے یعنی اُردو ادب کا علمی ذخیرہ تمام تر انھیں ممتاز و مشہور مصنفین کی کوشش کا اندوختہ ہے، باقی دوسرے مصنفین ایک حیثیت ثانوی رکھتے ہیں اب جب تک ہم ان سب کی ادبی حیثیت پر روشنی نہ ڈالیں مدح سرائی کی تمہید لاعلمی میں رہتی ہے۔ ایک کی نسبت دوسرے کی رائے سنیئے مولانا حالی کہتے ہیں

"سرسید اُردو ادب سے مخصوص دلچسپی نہیں رکھتے تھے،

ان کے کارناموں کی تہ میں مذہبی اصلاح کا جذبہ کام کر رہا تھا۔"

ان کے "تہذیب الاخلاق" جاری کرنے کا اصل مقصد مسلمانوں کی اصلاح و ترقی تھی۔ ان کے پیش نظر یہی ایک مقصد تھا جس کو انھوں نے مختلف ذرائع سے اجاگر کیا۔ ان کی سائنٹفک سوسائٹی، خطبات احمدیہ، تفسیر قرآن، مدرسۃ العلوم اور ایجوکیشنل کانفرنس ایک ہی مرکز و مقصد کو لیے ہوئے پھولے پھلے۔ ان کی نثر میں روانی و برجستگی ناپید ہے۔ بلکہ بقول نعیمی صاحب "بہت سے جملے کے جملے ایسے معلوم ہیں جیسے عربی عبارت کا بامحاورہ لفظی ترجمہ کیا ہے اگر اس میں مبالغہ نہیں ہو تو ہماری ادنیٰ رائے بھی یہی ہے کہ سرسیّد کو ہر لحاظ سے ایک بڑا انسان کہا جا سکتا ہے لیکن ایک بڑا انشاپرداز نہیں کہا جا سکتا"

ان کی اصلاحی ترقیوں کا لحاظ کرتے بلاشبہ ان کا ہر کارنامہ تعمیری کہلائے جانے کا مستحق ہے نہ کہ ادبی۔ وہ ایک بہترین قومی مصلح ہیں لیکن اتنے بڑے انشاپرداز نہیں۔

سرسیّد کے بعد حالی آتے ہیں۔ کیونکہ بقول مہدی مرحوم۔

"ان کے قلم کو جو ہاتھ میں لے سکتا ہے وہ مولانا حالی ہیں"

اور بقول نعیمی حالی نے نثر لکھی اور ایک عمدہ نثار بن کر لکھی۔ مانا کہ ان کی نثر سلیس سادہ متین و سنجیدہ ہے لیکن بعض اوقات یہی سادگی اس کو ایسا

"روکھا پھیکا" بنا دیتی ہے کہ ادبی جھلک ناپید ہو جاتی ہے۔ پھر ان کی انگریزیت سے "حیات جاوید" کی دنیا معمور ہے۔ یہ ایک نمایاں سقم ہے ان کی علمی کارناموں کا، حیات سعدی، یادگار غالب اور حیات جاوید ان کی بہترین تصانیف ہیں۔ مگر ان سب کا ڈگرو ہی سوانح حیات ہے۔ ان کا مقدمۂ شعر و شاعری باوجود مختصر ہونے کے ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ نعیمی صاحب کی یہ رائے کس قدر سخت اور صحت سے معرا معلوم ہوتی ہے مگر اس میں اصلیت کی کچھ نہ کچھ جھلک ضرور موجود ہے۔

حالی کے بعد نذیر احمد کا نمبر آتا ہے۔ جو دو خصوصیات کے حامل ہیں۔ ناول نگار بھی ہیں، مذہبی مصنف بھی، ان کو اردو کا پہلا ناول نگار کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ ان سے پہلے بھی اردو میں قصّے اور ناول پائے جاتے تھے لیکن اس پایہ کے نہیں۔ ان کے ناول عام طور پر "مقصدی" ہوتے ہیں اور ان میں ضرورت سے زیادہ سبق آموزی سے کام لیا گیا ہے۔ ان کے مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح اور ابن الوقت بلند پایہ تصانیف ہیں۔ مولوی فرحت اللہ صاحب نے ان پر بھی تقریباً چوٹ چلی ہے کہ وہ چلتے چلتے عربی الفاظ کے روڑے ہی نہیں بچھاتے تھے بلکہ پہلو ر کھ دیتے تھے۔ لیکن ہمارے نزدیک ان کا یہ اعتراض ان کی عام روانی و بے ساختگی کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

ان کے بعد شبلی آتے ہیں ۔ جن کی تحریروں کے زبردست رہنما سرسید، حالی، نذیر احمد اور آزاد ہیں۔ " استدلال انھوں نے سرسید سے سیکھا۔ تحقیق آزاد سے لی۔ زورِ بیان نذیر احمد کا لیا اور سادگی، صفائی حالی سے سیکھی۔ اس لیے ان کا طرزِ تحریر ان کے معاصرین کی تمام خوبیوں کا حامل ہے۔" گویا شبلی ایک معجون مرکب طرز کے مالک ہیں، آزاد کی رنگینی، حالی کی سادگی اور نذیر احمد کا زور بیان و بے ساختگی کو موقع و محل سے استعمال کرتے ہیں۔ آزاد کی آبِ حیات کا اثر شبلی کی شعر العجم یا سیرۃ النبی میں دیکھیے۔ کہیں کہیں جملے کے جملے آ گئے ہیں اور شاید ان کے تیل سے اپنا چراغ روشن کیا ہے۔ شبلی کا طرز مولویانہ ہے مگر آزاد کے عنصر بلیغ کو شبلی نہیں پہنچ سکتے۔ ان کی رنگینیٔ خیال کو البتہ شبلی نے آنکھوں سے کاجل کی طرح لے لیا ہے لیکن ان کے طرز کی رنگینی نہیں لے سکے۔ جو صرف آزاد ہی کا حصہ ہو کر رہ گئی ہے۔ نعیمی صاحب فرماتے ہیں۔

" حقیقتاً نذیر احمد اور آزاد صاحب طرز کہے جا سکتے ہیں سرسید، حالی اور شبلی نہیں۔ صاحبِ طرز سے میرا مطلب یہ ہے کہ ایک ایسے طرز کا مالک جس میں انفرادیت بہت بڑی حد تک نمایاں ہو۔ صرف ایک ہی جملہ سے یہ اندازہ ہو جائے کہ یہ جملہ فلاں شخص کا ہے۔"

قصہ مختصر شبلی کی شہرت و مقبولیت جتنی بہ حیثیت مورخ کے ہے اُتنی بہ حیثیت انشا پرداز کے نہیں۔

اب آزاد کو لیجئے۔ نہ یہ سوانح نگار ہیں نہ مؤرخ، نہ مذہبی مصنف ہیں نہ ناول نویس، وہ محض انشا پرداز ہیں اور بس۔

آزاد اپنی تصانیف میں اپنے آپ کو دھراتے نہیں۔ عام طور پر اہل قلم دو چار تصنیفات کے بعد تھک جاتے ہیں۔ ان کا قلم نقش و نگار کا کندھا ڈال دیتا ہے۔ تیسری سے جہاں یہ چوتھی تصنیف ہوئی الفاظ کی تکرار، تشبیہ استعارے کی تکرار، پیرایہ کی تکرار، پوری زبان کی تکرار۔ غرض یہ کہ مصنف اپنی ذات اور ذہنیت اور طرز کی تکرار ہی تکرار کرنے لگتا ہے اور جب یہ واقعہ پیش آجائے تو اس کی نئی کتاب پڑھنے کو دل آمادہ نہیں ہوتا اور کسی مجبوری سے پڑھنے بھی لگیں تو جی بار بار اُچاٹ ہو جاتا ہے۔

نعیمی صاحب فرماتے ہیں کہ "پوری کی پوری تصانیف ایک ہی رنگین و رواں انداز میں لکھ دینا یہ آزاد کے سوا نہ کوئی کر سکا نہ امید ہے کہ اب کر سکے"۔

پس اس یگانۂ عصر ادیب نے حقیقت میں نثر میں شاعری بلکہ ساحری کی ہے۔ بقول سعید انصاری۔

"نذیر احمد کے اسلوب کی راشد الخیری نے مولانا حالی کی

مولوی عبدالحق نے پیروی کی۔ لیکن آزاد اپنے میدان کا تنہا شہسوار ہے۔ اگرچہ نصیر حسین خاں خیال نے کوشش کی تھی لیکن کوئی شہکار نہیں چھوڑا۔"

سنیئے تو آزاد کے معترضین (جنھوں نے کہا ہے کہ آزاد کا طرزِ تحریر سنجیدہ موضوعات کے لیے موزوں نہیں) سے حفیظ نعیمی کیا پوچھتے ہیں۔

"کیا تاریخ، سوانح، ادبی تنقیدات، ادبیات مکاتیب، سفرنامہ اور لسانیات (فیلالوجی) وغیرہ سنجیدہ موضوعات نہیں ہیں۔"

ادبی تنقید ایک خشک اور روکھا، پھیکا موضوع ہے۔ لیکن ہمارے انشا پرداز کی انشا پردازی یہاں بھی آشکارا ہے۔ تاریخ دیکھنی ہو تو دربار اکبری اٹھا کر دیکھو اور زبان کی تاریخ کے لیے آبِ حیات کا دیباچہ پڑھو۔ ذرا بقائے دوام کا دربار دیکھو۔ یہاں تاریخ بھی ہے، ادب بھی۔ رنگینی بھی ہے، رعنائی بھی۔ اب اگر مولانا شبلی اپنی تاریخ دانی کی روشنی میں اس کے کسی فقرے پر یہ اعتراض کر بیٹھیں تو اس کی قدر و قیمت میں کوئی کمی نہیں آتی۔ آزاد غریب کو تاریخ دانی کا دعویٰ ہی کب تھا۔

غرض آزاد نے صرف اردو زبان کی خدمت کی۔ اردو کی تاریخ لکھی شعرا کی سوانح لکھیں ان کے کلام پر تنقید و تبصرہ کیا۔ اردو داں پبلک کے لیے آبِ حیات

نیرنگِ خیال، ڈرامہ اکبر لکھ کر اُردو ادب میں افسانے، قصّے اور ڈرامے کا شاندار اضافہ کیا، پنجاب کے لیے چھوٹی چھوٹی درسی کتابیں لکھ کر پنجابیوں کو اُردو سیکھنے میں مدد دی۔ علوم میں علم الالسنہ پر وہ ضخیم کتاب لکھی جس نے ایک نیا راستہ بنایا۔

جس شاعری کا جھنڈا لیے ہوئے ہندوستان کے مشہور ترین شعرا آگے بڑھ رہے ہیں سب سے پہلے وہ حالیؔ نے نہیں، آزادؔ نے بلند کیا تھا۔ آج جو وسیع میدان ہمارے شاعروں کے سامنے ہے اس کا راستہ اسی خادم قوم نے سمجھایا تھا جسے دنیا آزادؔ کے نام سے یاد کرتی ہے۔ آزاد ہی وہ شخص تھا جس نے اپنی زبان اور اپنے ادب کی خدمت پر اپنے ہوش و حواس اپنی صحت اور اپنی زندگی کو قربان کر دیا۔

مہدی الافادی نے۔ جن کی نسبت شبلیؔ نے لکھا ہے۔ "کاش شعرالعجم کے مصنف کو ایسے دو فقرے بھی لکھنے نصیب ہوتے" آزادؔ کی عدیم النظیر انشا پردازی کی داد اس طرح دی ہے۔

"مہرالنسا کا وہ واقعہ کس قدر دلچسپ ہے جب اس نے باغ کی ایک روش پر جہانگیر کے ہاتھ سے کبوتر لے کر چھوڑ دیے تھے، پروفیسر آزادؔ نے جس خوبصورتی سے اس کو دکھایا ہے انشا پردازی کو آج تک اس سے بہتر الفاظ نہ مل سکے۔"

واقعہ[1] دیکھیے واقعی کتنا دل چسپ ہے۔

"دنیا کے معاملات سخت نازک ہیں۔ کوئی بات ایسی نہیں جس کے فوائد کے ساتھ نقصان کا کھٹکا نہ لگا ہو۔ اسی آمد و رفت میں سلیم (جہانگیر) کا دل زین خاں کوکہ کی بیٹی پر آیا اور ایسا آیا کہ قابو ہی میں نہ رہا۔ غنیمت ہوا کہ اس کی ابھی شادی نہ ہوئی تھی۔ اکبر نے خود شادی کر دی۔ لیکن قابل عبرت وہ معاملہ ہے جو کہن سال بزرگوں سے سنا ہے یعنی یہی مینا بازار لگا ہوا تھا بیگمات پڑی پھرتی تھیں۔ جیسے باغ میں قمریاں یا ہریاول میں ہرنیاں۔ جہانگیر ان دنوں نوجوان لڑکا تھا۔ بازار میں پھرتا ہوا چمن میں آ نکلا۔ ہاتھ میں کبوتر کا جوڑا تھا۔ سامنے کوئی پھول کھلا ہوا نظر آیا کہ عالم سرور میں بہت بھایا۔ چاہا کہ توڑے۔ دونوں ہاتھ رکے ہوئے تھے۔ وہیں ٹھہر گیا، سامنے سے ایک لڑکی آئی۔ شہزادہ نے کہا۔ لو ہمارے کبوتر تم لے لو، ہم وہ پھول توڑ لیں۔ لڑکی نے دونوں لے لیے شہزادہ نے کیاری میں جا کر چند پھول توڑے۔ پھر کر آیا تو دیکھا کہ لڑکی کے ہاتھ میں ایک ہی کبوتر ہے۔ پوچھا دوسرا کبوتر

[1] دربار اکبری صفحہ (۱۵۵)

کیا ہوا عرض کی، صاحب عالم وہ تو اڑ گیا۔ پوچھا ہیں، کبوتر اڑ گیا۔
اس نے ہاتھ بڑھا کر دوسری مٹھی بھی کھول دی کہ حضور یوں
اڑ گیا۔ اگرچہ دوسرا کبوتر بھی ہاتھ سے گیا، مگر شہزادے کا دل
اس انداز پر لوٹ گیا۔ پوچھا تمھارا نام کیا ہے۔ عرض کی مہرالنسا
خانم۔ پوچھا تمھارے باپ کا کیا نام ہے۔ عرض کی مرزا غیاث۔
حضور کا ناظم بیوتات ہے۔ کہا اور امراء کی لڑکیاں محل میں آیا
کرتی ہیں۔ تم ہمارے ہاں نہیں آتیں۔ عرض کی میری اماں جان
تو آتی ہیں مجھے نہیں لاتیں۔ ہمارے ہاں لڑکیاں گھر سے باہر
نہیں نکلا کرتیں۔ آج بھی بڑی منتوں سے یہاں لائی ہیں۔ کہا،
تم ضرور آیا کرو۔ ہمارے ہاں بڑی احتیاط سے پردہ رہتا ہے۔
کوئی غیر نہیں آتا۔"

پھر بھی مہدی ایک واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"لاہور میں پہلی دفعہ جب ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ ہوا
تو پروفیسر آزاد زندہ تھے۔ نذیر احمد ملنے گئے۔ شبلی و حالی بھی
ساتھ گئے۔ نذیر احمد کا لکچر ہونے والا تھا۔ جو چھپا ہوا ان کے
ہاتھ میں تھا۔ انھوں نے یہ کہہ کر آگے بڑھا دیا کہ ایک نظر دیکھ لیجیے۔

آزاد فوراً قلم سنبھال کر بیٹھ گئے اور کاٹ چھانٹ شروع کر دی۔ نذیر احمد آزاد کی اس بے تکلفی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ جوشِ محبت سے ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ان کو خیال ہوا کہ ابھی ان کے دائرے میں ایک شخص ایسا موجود ہے جو "بوڑھے بچے" کی مشقِ سخن پر نظرِ ثانی کر سکتا ہے۔"

مولانا حالیؔ، آزاد کی نسبت لکھتے ہیں۔

"نظم و نثر میں بہت کچھ لکھا جا رہا ہے، یعنی لٹریچر کے رقبے کا طول و عرض بڑھ گیا ہے لیکن اس کا ارتفاع جہاں تھا وہیں رہا، یعنی اخلاقی سطح بہت اونچی نہیں ہوئی۔ لیکن آزاد کی پاکیزہ خیالی اور خوش بیانی نے یہ کمی پوری کر دی۔"

شبلیؔ اپنے کمالات کے باوجود آزاد کا ادب کرتے اور فرماتے تھے۔

"آزاد اُردوئے معلیٰ کا ہیرو ہے۔ اس کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں، وہ اصلی معنوں میں ایک زبردست انشا پرداز ہے۔"

مولانا عبد اللہ عمادی میرے خط کے جواب میں ارقام فرماتے ہیں۔

"آزاد انشا پردازی اور نثر نگاری کے شہنشاہ تھے۔ ان کے اسلوب کی ابتدا انہیں سے ہوئی اور انہیں پر انتہا

ہوگئی۔ شاعر تھے مگر شاعری میں کوئی نمایاں کام نہ کرسکے۔ پھر بھی لاہور کو ہنوز وہ ادبی صحبتیں فراموش نہیں ہوئیں۔ جن کے چشم و چراغ مولنٰنا حالی اور مولنٰنا آزاد تھے"۔

کیفی دہلوی آزاد کی نسبت یہ حسن خیال رکھتے ہیں۔

آزاد وہ موجد عالم ایجاد سے مُنہ موڑتا ہے جس کے ایجاد و جدت آفرینی کے احسانات کے بوجھ سے اُردو زبان کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی، چاسر اور ایڈیسن نے جو احسان انگریزی نظم و نثر پر کیے ہیں، کیٹو اور پدماکر نے جو خدمات ہندی کاویہ کے حق میں کیں ان سے زیادہ مہتم بالشان اور گراں مایہ وہ خدمات اور وہ احسانات ہیں جو آزاد نے اُردو نظم پر بالخصوص اور اُردو زبان پر بالعموم کیے ہیں۔ زلف و خال، حسن و عشق، رقیب و رازداں، محتسب و ناصح، آہ رسا و نالۂ شب گیر کے وہمی قیود سے شعر کو آزاد کرنے کا سہرا آزاد ہی کے سر ہے۔ اس میں کچھ مبالغہ نہیں کہ اگر آزاد نے اس خیال نو کی اشاعت و تعمیل نہ کی ہوتی تو آج ہم ان نظموں سے نا آشنا ہوتے جن میں قومی نظمیں، اخلاقی نظمیں، نئی شاعری یا نیچرل شاعری کہا جاتا یا ان سے منسوب کیا جاتا ہے"۔

خصوصاً موجودہ دور زندگی میں ہر شخص یہ احساس رکھتا ہے کہ یہ زمانہ عمل کا ہے، صرف تخیل ہی تخیل کام نہیں آسکتا۔ اقبال اور جوش کی نظمیں آزاد کی ڈگر پر قایم ہوئیں اور ایک جوشیلے طبقہ کے دل میں گھر کر چکی ہیں یہ وہی داغ بیل ہے جو آزاد نے ڈالی۔ اس سے انصاف پسند دنیا کبھی انکار نہیں کر سکتی۔

مولوی فرحت اللہ بیگ صاحب میرے خط کے جواب میں لکھتے ہیں۔

"آزاد مرحوم کی تحریر کا جتنا میں قائل ہوں شاید ہی اور کوئی ہوگا تحریر کا جو رنگ انھوں نے اختیار کیا ہے اس کے وہی موجد اور وہی خاتم ہیں۔ دوسروں نے بھی اس رنگ کو اختیار کرنا چاہا گو نبھا نہ سکے۔ آخر چھوڑ بیٹھے۔ مرحوم کے قلم میں وہ زور اور طرزِ بیان میں وہ اثر ہے کہ ان کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک فقرہ پڑھنے والے کے دل میں اتر جاتا ہے۔ غرض یہ کہ آزاد اپنے رنگ کے بادشاہ تھے اور گو وہ رنگ اردو میں چلا نہیں کیونکہ کسی میں اس کے چلانے کا دم نہ تھا۔ لیکن جب تک دنیا میں اردو ہے اُس وقت تک آزاد مرحوم کی تحریریں عزت کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی اور سر آنکھوں پر رکھی جائیں گی۔"

آزاد کے خیالات کی روانی کو ایک دریا سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جو بہتا ہے

اور اس کا تسلسل بوقلموں تعمیرات کا حامل ہوتا ہے۔ کبھی مرغزاروں میں سے
اس کا گذر ہوا تو وہاں کے پرکیف مناظر قدرت اور دلاویز نظارے اس کی
سیدھی سادھی روش میں ایک لوچ پیدا کر دیتے ہیں، کہیں یہ لق و دق میدانوں
میں سے ہوتے ہوئے گذرتا ہے تو کہیں سنسان وادیوں اور ویران صحراؤں کے
خشک پتھریلے آغوش میں جگہ پاکر اپنے سحر آگین نغموں سے ایک سنسنی خیز موسیقی
پیدا کر دیتا ہے۔ کبھی اپنے امواج کے بے پناہ تھپیڑوں سے سنگین چٹانوں کو
ٹکرا کر دل گداز نالے پیدا کرتا ہے تو کہیں پہاڑوں کی بلندیوں اور کہسار کے
سایہ میں آبشار کے بھیس میں سرگوشیاں کرتے ہوئے فضا میں اپنی وجدانی
کیفیات و جذبات کو منتشر کرتا رہتا ہے، غرض یہ کہ ایک گم کردہ راہ مسافر
کی طرح جس کو منزل مقصود پر پہنچنے کے بعد اطمینان و آسودگی نصیب ہوتی
ہو۔ یہ بھی بحر ناپیدا کنار سے وابستہ ہو کر اپنی ہستی کو مٹا دیتا ہے۔ بعینہٖ
یہی حال آزاد کی ادبی روانیوں کا ہے کہ ہر منزل پر اس کے ادب کا
سرچشمہ ایک نئے قسم سے جلوہ نما ہوتا ہے۔

یا پھر آزاد کی ادبی جھلک اور اس کی ہنگامہ کن رعنائیاں چاند سے
مشابہت رکھتی ہیں جو اپنی ضیا پاشیوں سے ہر جگہ ایک نیا سماں، ایک
نئی کیفیت، ایک نئی رونق پھیلا دیتا ہے اور شام غربت کی فضا میں اپنی

سوانح آزاد کے ماخذ

۱۔ خمخانہ جاوید۔ جلد اول

۲۔ جدید اردو شاعری

۳۔ منشورات کیفی

۴۔ سیر المصنّفین جلد دوم

۵۔ گلِ رعنا

۶۔ ادب اردو۔ سکسینہ

۷۔ مولانا محمد حسین آزاد۔ مؤلفہ غالب الہ آبادی

۸۔ مجلّہ مکتبہ۔ بابت خورداد سنہ ۳۷ ف

۹۔ رسالۂ ساقی (دہلی) بابت مارچ سنہ ۳۸ء

۱۰۔ اردو کے اسالیب بیان

۱۱۔ (دیباچہ) یورپ میں دکھنی مخطوطات

۱۲۔ نکات الشعراء

۱۳۔ گراہام بیلی

۱۴۔ دہلی کالج مرحوم

۱۵۔ مغل اور اُردو

۱۶۔ مضامین فرحت جلد دوم

۱۷۔ مولانا شبلی۔ اُردو کے بہترین انشا پرداز۔ سعید انصاری بی اے

ان اصحاب کرام نے ازراہِ علم پروری اپنی بیش بہا معلومات سے مستفید فرمایا

۱۔ عالی جناب نواب صدر یار جنگ بہادر

۲۔ جناب محمد شفیع صاحب پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور

۳۔ جناب مولوی عبدالحق صاحب

۴۔ مولٰنا عبداللہ عمادی صاحب

۵۔ مولوی نصیرالدین صاحب ہاشمی

۶۔ مولٰنا خواجہ حسن نظامی صاحب

۷۔ مولوی رضاء اللہ صاحب و مولوی فرحت اللہ صاحب دہلوی

(صاحبزادگان مولوی ذکاء اللہ صاحب مرحوم)

۸۔ مولوی مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب

۹۔ جناب آغا محمد اشرف صاحب ایم۔ اے
۱۰۔ جناب آغا محمد طاہر صاحب
} نبیرگان حضرت آزاد مرحوم

۱۱۔ جناب بہارت چند صاحب ایم۔ اے

ادارۂ ادبیات اُردو کی مشہور و معروف کتابیں

مرقع سخن (جلد اول)	حیدرآباد دکن کے پچیس شعرائے دور آصفیہ کا باتصویر تذکرہ پچاس سے زیادہ تصاویر اور چار سو سے زیادہ صفحات مجلد قیمت (صمہ)
مرقع سخن (جلد دوم)	حیدرآباد دکن کے پچاس دیگر شعرائے دور آصفیہ کا باتصویر تذکرہ پچاس تصاویر چار سو صفحات مجلد قیمت (صمہ)
سراج سخن	انتخاب کلام شاہ سراج اورنگ آبادی۔ مرتبہ پروفیسر عبدالقادر سروری مع سوانح شاہ سراج۔ صفحات (۱۴۰) قیمت (۱۲ر)
ایمان سخن	انتخاب کلام شیر محمد خاں ایمان مرتبہ سید محمد صاحب ایم اے مع سوانح ایمان صفحات (۱۴۰) قیمت (۱۲ر)
فیض سخن	انتخاب کلام حافظ میر شمس الدین محمد فیض۔ مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مع سوانح فیض صفحات ۱۴۴ قیمت (۱۲ر)
بادۂ سخن	انتخاب کلام ڈاکٹر احمد حسین مائل مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مع سوانح و تصویر صفحات (۱۲۸) قیمت (۱۲ر)
کیف سخن	انتخاب کلام سید رضی الدین حسن کیفی مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مع سوانح و تصویر صفحات (۱۲۲) قیمت (۱۲ر)
متاع سخن	انتخاب کلام نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مع سوانح و تصویر عزیز صفحات ۱۲۵ قیمت (۱۲ر)
ورڈزورتھ اور اس کی شاعری	مشہور انگریز شاعر کے حالات اور کلام پر تبصرہ از مولوی میر حسن صاحب ایم اے مع تصویر شاعر ۹۳ صفحات قیمت (۸ر)

ٹیگور اور اُن کی شاعری
ہندوستان کے مشہور شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کے حالات اور کلام پر تبصرہ از مولوی مخدوم محی الدین صاحب ام اے مع تصویر شاعر صفحات (۱۲۸) قیمت عہ۔

یوسف ہندی قید فرنگ میں
مرزا غالب کی قید فرنگ کے حالات مرتبہ مولوی محسن بن شبیر صاحب بی اے ال ال بی عثمانیہ قیمت ۸ر

ہوش کے ناخن (ڈرامہ)
حیدرآباد کی سماجی زندگی کا خاکہ مصنفہ مخدوم محی الدین و میر حسن صاحبان صفحات (۹۶) قیمت (عہ)۔

نذر ولی
ولی اورنگ آبادی کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی مضامین کا مجموعہ۔ از لطیف النساء بیگم ام اے، نجم النساء بیگم ام اے، جہاں بانو بیگم ام اے اور نعیم النساء بیگم ام اے۔ صفحات (۲۴۸) قیمت صرف (عاں ۸ر)۔

نقد سخن
کلام فانی پر نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز کی تنقیدوں کا مجموعہ صفحات (۱۷۶) قیمت صرف (عہ)۔

گریہ و تبسم
صاحبزادہ میکش کی دلکش نظموں کا مجموعہ صفحات (۱۹۲) قیمت (عاں)

مشاہیر قندھار دکن
دکن کے مشہور مردم خیز خطہ کی دلچسپ با تصویر تاریخ۔ از اکبر صدیقی بی اے صفحات (۱۸۴) قیمت صرف (عہ)

من کی دنیا
نوجوان انشاپرداز رشید قریشی کے دلچسپ اور ولولہ انگیز افسانوں کا مجموعہ صفحات (۱۶۰) قیمت مجلد صرف (عہ)

مدراس میں اردو
مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی کی محققانہ تالیف صفحات (۲۰۰) قیمت مجلد (عہ ۸ر)۔

نذر دکن (با تصویر) دکن کے متعلق خواتین دکن کے رشحات قلم مع عکس تحریر و تصاویر صفحات (۱۱۲) مجلد قیمت (عہ ۴ ر)۔

محرم نامہ شہادت کربلا کے متعلق دلچسپ معلومات باتصویر مجموعہ صفحات (۱۱۲) مجلد قیمت (عہ)

روح غالب اُردو اور فارسی کے مشہور شاعر اور انشا پرداز مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی کی حیات اور کارناموں کی ایک مجمل سرگذشت اور ان کے بہترین اُردو خطوط کے دلچسپ ادبی حصوں کا انتخاب جس کو ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ نے نہایت محنت اور جاں فشانی سے مرتب کیا ہے اس کتاب میں پہلی دفعہ غالب کے خاندان اور اعزہ اور ان کے سسرالی اعزہ و اقارب کے تفصیلی شجرے بھی شایع کیے گئے ہیں۔ غالب کے حالاتِ زندگی جس خوبی اور اجمالی کے ساتھ اس میں درج ہیں آج تک کسی سوانح غالب میں شایع نہیں ہوئے۔

پرستاران غالب اور خاص کر وہ لوگ جو اس رفیع المرتبت شاعر کے صحیح اور مستند حالات معلوم کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے یہ کتاب ایک نادر تحفہ ہے (۲۴۰) صفحات باتصویر قیمت دو روپے آٹھ آنے (عاں ۸ ر)۔

تاریخ گولکنڈہ وہ کتاب جو کئی سال کی تحقیق اور محنت و معلومات کا نتیجہ ہے حیدر آباد کے مشہور مورخ اور جامعۂ عثمانیہ کے معلم تاریخ پروفیسر عبد المجید صاحب صدیقی ام اے۔ ال ال بی نے اس کتاب میں سلاطین قطب شاہیہ کی نہایت مستند اور مبسوط تاریخ قلم بند کر دی ہے۔ گولکنڈہ اور اس کی آس پاس کی سلطنتوں کے تعلقات، دکن کا تمدنی ارتقاء، بادشاہوں اور امیروں کے حالات، مختلف لڑائیاں، علم و فضل کی سرپرستی غرض ہر پہلو پر قدیم، نادر اور قلمی تاریخوں کی مدد سے روشنی ڈالی ہے۔ اپنے موضوع پر پہلی کتاب جو اس اہتمام سے لکھی گئی ہے۔

تاریخ گولکنڈہ باتصویر ہے اور اس کی تصویریں بھی اس کے مواد کی طرح قدیم تاریخی ماخذوں سے حاصل کی گئی ہیں۔ بڑی سائز، ڈھائی سو صفحات، خوب صورت جلد قیمت تین روپے آٹھ آنے (۳/۸)

من کی بپتا

صنف نازک کی ضرورتوں اور زندگی کی تلخیوں کے متعلق معرکۃ آلارا مشورے۔ اس دلچسپ ادبی کتاب میں حسب ذیل عنوانوں پر بڑی مفید اور کارآمد باتیں لکھی گئی ہیں۔ گھر، سواری، ہمارے نوکر، خورونوش، لباس بچوں کی تعلیم اور ان کی ضرورتیں، اخبار بینی، کتابیں، نذرونیاز چندے، مختلف رسومات، سینما، فیشن وغیرہ، ہر تعلیم یافتہ گھر میں اس کتاب کا ہونا ضروری ہے کتاب بہت خوب صورت اور مجلد ہے۔ مصنفہ محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ ام اے صفحات (۸۰) قیمت صرف آٹھ آنے (۸/)

سرگذشت غالب

اُردو اور فارسی کے مشہور شاعر و ادیب مرزا اسداللہ خاں غالب کی حیات، کارناموں اور اعزہ و احباب کا ایک مجمل تذکرہ ہے جس کو ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ ام اے۔ پی اچ ڈی (لندن) پروفیسر ادبیات اُردو جامعہ عثمانیہ نے نہایت تحقیق اور محنت سے مرتب کیا ہے۔ طلبہ اور ادب کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے بے حد مفید ہے غالب کی تصویر اور خاندانی شجرے بھی شایع کیے گئے ہیں یہ چھوٹی سی کتاب سالہا سال کی تحقیقات اور غالب کی تصنیفات اور ان کے متعلق جو کچھ ادب اب تک شایع ہوا ہے اس کا نچوڑ ہے۔ بڑی سائز صفحات (۶۴) قیمت صرف (۸/)۔